ISSN 2321-4627

اپریل 2022ء

-/15 روپے

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

نواب میر عثمان علی خان بہادر

سابق نظام ہفتم حیدرآباد

پیدائش : 6/اپریل 1886ء

نظام سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا افتتاح کرتے ہوئے

نظام سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے جاری کردہ کرنسی نوٹ اور سکّے

www.urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی	:	شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس	4

گوشۂ نظام سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر

میر عثمان علی خاں آصف سابع ۔ اخلاقی اقدار	:	نسیمہ تراب الحسن	5
نواب میر عثمان علی خان کی شاعری	:	طیبہ بیگم	9
نواب میر عثمان علی خان بہادر، نظام ہفتم حیدرآباد حیات اور کارنامے	:	ڈاکٹر خواجہ فریدالدین صادق ایڈوکیٹ	15

مضامین

علامہ اقبال کی ڈائری کے چند اندراجات	:	ڈاکٹر رؤف خیر	18
اکبرؔ، اقبالؔ اور اسرار خودی	:	ڈاکٹر محمد افضل	24
سراجؔ اورنگ آبادی کی غزلیہ شاعری: ایک جائزہ	:	ڈاکٹر خیرالدین اعظم	31
سرسید کے تعلیمی تصور میں تعلیم نسواں کے عنصر	:	ناہیدہ خاتون	37
جموں وکشمیر کا معتبر و مستند محقق: پروفیسر اکبر حیدری کشمیری	:	سجاد احمد صوفی	43
بچوں کی نشوونما میں ماؤں کا کردار	:	اسما فیروز	49
اُردو شاعری اور رنگ تصوف بہ حوالہ ڈاکٹر مقصود حسنی	:	مہر افروز	54

تعلیم و روزگار

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ اور ملک کی مجوزہ بنیادی تعلیم	:	آفتاب عالم	59
طلبہ میں خود توقیری، تعلیمی تحصیل اور سوشل میڈیا کا استعمال	:	مومن سمیہ	67

سائنس و ٹکنالوجی

ٹکنالوجی کا حیرت انگیز سفر روبوٹ	:	عزیز احمد ہاشمی	73

افسانے

ابابیل	:	خواجہ احمد عباس	75
خوف	:	ڈاکٹر فیاض احمد ڈار	78

حصہ نظم

غزلیں	:	ڈاکٹر مسعود جعفری / ڈاکٹر محسن جلگانوی	81
غزلیں	:	ذکی طارق بارہ بنکوی / فرید سحر	82

oOo

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و تہذیبی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 07 شمارہ : 04 اپریل 2022ء

ایڈیٹر

شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی

حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب وتزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : **84**

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana. Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

www.urduacademyts.com

ہم کلامی

ہم نے ماہ اپریل 2022ء کے شمارے کی ابتداء سابق ریاست حیدرآباد حکومت آصفیہ کے ساتویں تاجدار نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے علمی، ادبی، عوامی وتعمیراتی کارناموں کو محیط تین اہم مضامین پر مشتمل ''گوشہ نظام سابع'' سے کی ہے۔ جس کی شروعات ممتاز بزرگ ادیب محترمہ نسیمہ تراب الحسن کے مضمون ''میر عثمان علی خاں آصف سابع کے اخلاقی اقدار'' سے کی ہے جس میں انہوں نے نواب میر عثمان علی خاں کے اخلاقی اقدار پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے ادبی منظر نامہ میں ان کی شاعری بھی ایک اہم صنف ہے جس پر محترمہ طیبہ بیگم کی کتاب ''آصف سابع میر عثمان علی خاں اوران کا عہد'' سے ان کے مضمون ''نواب میر عثمان علی خان کی شاعری'' میں سے چند اقتباسات شائع کئے گئے ہیں، گوشہ کے آخر میں ڈاکٹر خواجہ فریدالدین صادق کا ''نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام ہفتم حیات وکارنامے'' کے عنوان سے مختصر ومفید مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دیگر مضامین میں علامہ اقبال کی ڈائری کے چند اندراجات کے عنوان سے ڈاکٹر رؤف خیر کی تحریر، اکبر اقبال اور اسرار خودی کے عنوان سے ڈاکٹر محمد افضل، سراج اورنگ آبادی کی غزلیہ شاعری پر ڈاکٹر خیر الدین اعظم کا مضمون، اسی طرح ریسرچ اسکالرس کے مضامین پھر تعلیم وروزگار میں قومی تعلیمی پالیسی اور طلبہ میں خود توقیری وتعلیمی تحصیل پر ڈاکٹر آفتاب عالم اور مومن سمیہ کے مضامین، سائنس وٹکنالوجی میں روبوٹ پر جناب عزیز ہاشمی کی تحریر اور حسب معمول ممتاز افسانہ نگار خواجہ عباس کا افسانہ ابابیل اور ڈاکٹر فیاض احمد ڈار کا افسانہ خوف اور آخر میں معروف شعرائے کرام ڈاکٹر مسعود جعفری، ڈاکٹر محسن جلگانوی، جناب ذکی طارق اور جناب فرید سحر کے ادبی ومزاحیہ کلام کو اس شمارے کی زینت بنایا گیا ہے۔ امید کہ قارئین اس ترتیب کو پسند کریں گے اور یہ تمام نگارشات ان کے ذوق ادب میں مزید اضافہ کا سبب بنیں گی۔

موجودہ دور میں ہماری نئی نسل اپنی مادری زبان سے دور ہورہی ہے، اس کی وجہ سرپرستوں اور والدین کی اس زبان سے بے اعتنائی ہے، شاید والدین اور سرپرست یہ خیال کرتے ہیں کہ اردو ذریعہ تعلیم سے بچوں کو آگے روزگار کے مسائل ہوں گے، جب کہ ایسا نہیں ہے، ہمارے ہردلعزیز عزت مآب وزیر اعلیٰ جناب کے۔ چندر شیکھر راؤ اقلیتوں کے مسائل خاص کر اردو زبان کی ترقی وترویج کے سلسلہ میں بہت سنجیدہ ہیں۔ حکومت تلنگانہ نے ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے اور اس پر عمل آوری کے لئے اہم سرکاری دفاتر میں 60 سے زائد اردو آفیسرس کا تقرر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ حکومت کے قائم کردہ 204 اقلیتی اقامتی مدارس میں بھی اردو پڑھائی جارہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اولیائے طلباء اس جانب پوری توجہ دیں اور اگر اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کروانے میں کچھ تحفظات رکھتے ہوں تو کم ازکم دوسری زبانوں کے ساتھ بحیثیت اختیاری مضمون کے اردو ضرور پڑھائیں تاکہ یہ زبان آئندہ نسلوں تک باقی رہ سکے۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اردو زبان وادب کے تحفظ، ترقی وترویج کی اسکیمات کی عمل آوری میں مصروف ہے۔ اکیڈیمی کی معلنہ اسکیمات جن میں کارنامہ حیات ایوارڈ، بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ، اردو مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں جزوی مالی اعانت، اردو مطبوعات پر انعامات، چھوٹے اردو اخبارات اور اردو الیکٹرانک میڈیا کی مالی اعانت کے لئے وصول درخواستوں کی تنقیح اور انتخاب کے سلسلہ میں کمیٹیوں کی تشکیل کا عمل جاری ہے، امید کہ ان اسکیمات کی بہت جلد عمل آوری ہوجائے گی۔

قومی زبان کے قارئین اور محبان اردو سے گذارش ہے کہ وہ اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے کاموں میں ہمارا ساتھ دیں اور اپنے زرّین مشوروں سے نوازتے رہیں۔

آپ سب کو ماہِ رمضان کی سعادتیں، برکتیں اور رحمتیں مبارک ہوں۔

شاہ نواز

شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

ایڈیٹر

www.urduacademyts.com

میر عثمان علی خاں آصف سابع ۔ اخلاقی اقدار

آصف جاہی دور کی دو سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر فرمانروا نے اپنے اپنے دور حکومت میں کسی نہ کسی وجہ سے مقبولیت حاصل کی لیکن مذہبی رواداری کا دھیان ہر آصف جاہی حکمران کے دامن گیر رہا۔ سب کا ذکر ایک وقت میں کرنا ناممکن ہے اور صرف ایک بادشاہ کے دور حکومت کا حال بھی اتنا تفصیل طلب ہے کہ بڑے بڑے مورخین یا دانشوروں نے اس وقت کے شعبہ زندگی کو مختلف ابواب میں لکھا ہے۔ میں نہ تو مورخ ہوں اور نہ ہی عالم، لیکن میں نے سن شعور میں قدم رکھنے کے بعد جو سنا جو دیکھا جو پڑھا وہی بتا سکتی ہوں اور وہ زمانہ تھا میر عثمان علی خاں کا۔

میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی ریاست ایک وسیع رقبہ پر مشتمل تھی۔ وہ صرف تاج دار دکن ہی نہیں تھے بلکہ اپنی رعایا کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اپنی بلند نظری اور انسانیت کے جذبے سے انہوں نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کو پیار و محبت کے رشتے میں باندھ لیا تھا۔ باوجود کہ سب کو مذہبی آزادی تھی لیکن سب شیر و شکر کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ کہنا چاہیے کہ حیدرآباد دکن نہ صرف دارالامن، دارالسلام بلکہ دارالرحمت تھا۔ اللہ کی رحمتیں اس سرزمین پر اپنا سایہ کئے ہوئے تھیں۔

میر عثمان علی خاں سابع کا دور حکومت 36 سال رہا۔ ظاہر ہے کہ ایک وقت میں اس کی تفصیل بیان نہیں ہوسکتی۔ حکومت کا نظم و نسق ہر شعبہ زندگی میں اعلیٰ خوبیوں کا مظہر تھا اور سب سے اہم مذہبی رواداری اور اس سے جڑی حکایتیں ہر مذہب کے اتحاد کا سرچشمہ تھیں۔ یکجہتی کے چراغ ہر بام و در پر جلتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ صرف میر عثمان علی خاں کی اعلیٰ ظرفی کا برتاؤ تھا جو انہوں نے اپنی رعایا کے ساتھ روا رکھا۔ مسجد، مندر، گردوارے، کلیسا، آتش کدہ سبھی کا احترام کیا جاتا تھا۔ ایسے قوانین مرتب کئے گئے تھے کہ کسی کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں اور اہل ریاست سکھ چین سے رہ سکیں۔ مساوات اور بے تعصبی کی جو مثال میر عثمان علی خاں نے قائم کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جہاں انہوں نے مسجدوں، عاشورخانوں، درگاہوں کی امداد کی وہیں مندروں، گردواروں، کلیساؤں اور آتش کدوں کی مالی سرپرستی بھی کی جیسے ضلع ناندیڑ کے قصبہ کولاس میں واقع دیول آننت گیری اور بالاجی کولاس کو رقم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ موضع اوردلی ضلع اورنگ آباد میں غار ہائے ایلورہ کے بالکل نیچے مہارانی اہلیہ بائی ہولکر کے تعمیر کردہ کنڈ اور اس کنڈ سے کچھ دور شیواجی کے شینو شور مندر کی مرمت اور تحفظ کا انتظام کیا۔ یہ حکومت کا فرض نہیں تھا بلکہ میر عثمان علی خاں کی اخلاقی اقدار کا کارنامہ تھا۔ مندر اور کنڈ کے پجاریوں کو حکومت کی طرف سے ہدایت دی گئی تھی کہ من مانی اور لاپرواہی سے کنڈ اور مندر کے استحکام کو نقصان نہ پہنچائیں، اس سے ظاہر ہے کہ حاکم وقت صرف مالی امداد دے کر غافل نہیں ہوتا تھا بلکہ تحفظ کا خیال بھی اس کے دامن گیر

www.urduacademyts.com

تھا۔ اسی طرح کا کتبہ دور سے تعلق رکھنے والے آثار یعنی ہنمکنڈہ کے ہزار ستون کی مرمت کے لئے اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا۔ بالاجی مادنا پیٹ مندر' شنکر باغ' مندر گول ناتھ' بھدراچلم اور تروپتی کے مشہور بالاجی مندر کے لئے سالانہ امداد دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ رینوکا دیوی مندر ضلع عادل آباد' بیکنٹھ مندر ناندیڑ' دیول مایا رام وغیرہ کی نگہداشت کے لئے بھی رقم دی جاتی تھی۔ ایسے نہ جانے کتنے مندر ہوں گے جن کا مجھے علم نہیں۔ اسی طرح چرچوں' گردواروں کے لئے بھی عطیے دیئے جاتے تھے۔ ساتھ ہی علماء' سجادہ نشین' پنڈتوں اور پجاریوں کو بھی سرپرستی حاصل تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو تاکید کے لئے فرمان جاری کیا کہ وہ دیول وغیرہ کے قریب چلہ قائم کریں نہ کوئی مذہبی جھنڈا نصب کریں۔ ہندو مسلم یا کسی بھی مذہبی جلسہ میں تحریریں یا خطابات میں ایسی باتیں نہ کی جائیں جس سے دوسرے فرقہ کی توہین ہو۔ ان سب احکامات کی نگرانی کے لئے کوتوال بلدہ کو نگران کار مقرر کیا گیا تھا۔ اصول ہر مذہب کے لئے یکساں نافذ تھے۔ مثلاً بزرگان دین کے عرس کے موقع پر اکثر طوائفوں کا ناچ گانا ہوتا تھا' اس کی ممانعت کردی گئی۔ اس طرح مندروں میں مذہبی رسوم کی انجام دہی کے لئے کمسن لڑکیاں مقرر کی جاتی تھیں اور دیوتاؤں کے نام پر غیر اخلاقی کام ان سے لیا جاتا تھا' اس کی بھی ممانعت کردی گئی۔ اس طرح کی تاکید ہر مذہب کے رہنماؤں کو کی گئی تھی۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ پابندیاں صرف شہر حیدرآباد کی حد تک نہیں تھیں بلکہ اضلاع اور گاوؤں میں بھی تھیں۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ مختلف مذاہب اور فرقوں میں مذہبی تنازعہ نہ پیدا ہو اور وہ ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کریں۔ مذہبی رواداری کی مثال میر عثمان علی خاں کے دور حکومت کو دوسروں سے امتیاز کرنے کی میزان ہے۔ وہ ایک روشن خیال اور روشن دماغ حکمران تھے۔ اپنی رعایا کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے لئے جو کارنامے انہوں نے انجام دیے وہ بے تعصبی کا سبق سکھاتے ہیں۔ بے شک یہ صفت انہیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی لیکن اس پر نہ صرف عمل پیرا رہنا بلکہ بڑھانا قابل تعریف بات ہے۔ جیسے جیسے ہم عہد عثمانی کے بارے میں پڑھتے جائیں ہماری معلومات کے خزانے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

میر عثمان علی خاں نے سرکاری خزانے یا اپنے ذاتی سرمایہ سے جو مالی امداد دی ان میں کبھی کسی طرح کی مذہبی تشخیص نہیں کی جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ مسجدوں' مندروں اور دوسری مقدس عبادت گاہوں کے لئے بڑی رقومات دی جاتی تھیں' جاگیریں اور مناصب بلالحاظ مذہب وملت عطا کئے جاتے تھے۔ انہوں نے بے شمار مدرسوں تعلیمی اداروں' یونیورسٹیز کو فیاضانہ طور پر مالی امداد دی جن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونا' شانتی نکیتن جامعہ ملیہ' آندھرا یونیورسٹی' بنارس ہندو یونیورسٹی' دارالعلوم دیوبند' انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور' سری وی رامن انڈین اکیڈیمی آف سائنس قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے ترجمے مراٹھی' گجراتی' ٹامل اور انگریزی میں کروائے تاکہ علاقائی لوگ اسلام کی تعلیمات سے بہ آسانی واقف ہوسکیں۔ انہوں نے سیرۃ النبی شاہ نامہ اسلام کے ساتھ مہابھارت کی اشاعت کے لئے رقومات دے کر اپنی

www.urduacademyts.com

وسیع النظری کا ثبوت دیا۔لوگوں کو حیرت ہوتی ہے یہ سن کر کہ انہوں نے مرہٹہ حکمران، اہم تاریخی شخصیت شیواجی کے نام سے منسوب اداروں کو بھی مالی امداد دی، ان کی داد و دہش بیرون ملک یعنی سات سمندر پار تک بھی جاری تھی اور ینٹل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی، لیڈن یونیورسٹی ہالینڈ کو آرکیالوجی کی تدوین واشاعت کے لئے کثیر رقم دی۔

سب مالی امداد جو بے تعصبی کے ساتھ دی جاتی تھی

اپنی رعایا کے ساتھ رواداری کا یہ برتاؤ تھا کہ مسلم ملازمین کو فریضہ حج ادا کرنے، مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے چھ ماہ کی رخصت، پیشگی تنخواہ کے ساتھ حاصل کرنے کی سہولت تھی اوراسی طرح ہندو ملازمین کو بھی یہی سہولت دی جاتی تھی۔ان کا کہنا تھا کہ ہر مذہب کے عقائد کا احترام کرنا چاہیے۔انہوں نے پست اقوام سے کہا ''میری نظر میں نہ کوئی قوم بلند و پست ہے اور نہ کوئی اچھوت ہے، میں سب کو برابر سمجھتا ہوں'' وہ اس بات کے قائل تھے کہ انسان کے ذاتی جوہر اور اعلیٰ کردار ہی اس کی عزت وعظمت کا باعث ہوتے ہیں۔یہ خیال ان کے دل میں جاں گزیں تھا جس کی وجہ سے وہ مذہب اور فرقہ وارانہ تعصب سے بلند تھے اور اپنی ساری رعایا سے شفقت کا برتاؤ کرتے اور کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں اس کا دھیان رکھتے تھے۔حد تو یہ کہ لباس خاص قومی تھا اور اس میں اتنی یکسانیت تھی کہ ہندو مسلم کا فرق دشوار تھا۔جب سیٹھ ساہوکار دربار میں آتے تو اپنی پیشانی پر قشقہ لگانے پر انہیں ممانعت نہیں تھی۔

میر عثمان علی خاں نے اخلاقی رواداری کی جو ریت نبھائی وہ صرف روپیہ پیسہ کی مالی امداد دے کر ہی نہیں بلکہ اپنی سلطنت کے اہم عہدوں پر بھی مساویانہ رویہ رکھا اور حیدرآباد کو ایک مثالی ریاست بنا کر ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔حکومت کے نظم ونسق کے ہر شعبہ میں ہندو، مسلم، سکھ، پارسی ہر قوم کے قابل لوگوں کو مامور کیا۔چاہے وہ باب حکومت ہو، عدالت ہو، صرف خاص ہو، پولیس ہو، فوج ہو، مالگزاری ہو، دارالضرب ہو، تعلیم ہو، صنعت وحرفت ہو، کروڑ گیری ہو، صحت عامہ ہو، ریلوے ہو یا مذہبی امور ہوں ان سب کی تفصیل سنانا تو ممکن نہیں لیکن مختصر طور پر یہ بتاؤں گی کہ ریاست کے وزیراعظم مہاراجہ کشن پرشاد تھے۔راجہ فتح نواز ونت، وینکٹ راما ریڈی، تاراپوروالا، راجہ نرسنگھ راج۔36 سالہ دور حکومت میں ہر محکمہ کے عہدیداروں کی بڑی لمبی فہرست ہے، چنانچہ میں کچھ نام بتائے دیتی ہوں جو مختلف اہم خدمات پر برسراقتدار تھے:

سرفریدوں ملک بہادر، نواب سعید احمد چھتاری، نواب سر اکبر حیدری یعنی حیدر نواز جنگ، سید حسین بلگرامی (جو نواب اعتماد الملک تھے)، نواب خان خاناں بہادر، نواب عقیل جنگ، نواب زین یار جنگ جو آرکیٹکٹ تھے، نواب مہدی یار جنگ، خسرو جنگ بہادر، راجہ دھرم کرن بہادر، نواب ذوالقدر جنگ بہادر، محسن الملک، رائے بیج ناتھ صاحب، سالار جنگ بہادر، راجہ دھن راج گیر، نواب دین یار جنگ، نواب عابد نواز جنگ، راجہ اندر کرن بہادر، فصاحت جنگ جلیل جو میر عثمان علی خاں کے استاد تھے۔نواب سراج یار جنگ، نواب جیون یار جنگ، سید محمد حسین جعفری، آغا حیدر حسن، شاہی ڈاکٹرز میں ڈاکٹر حذیو جنگ گریم، ڈاکٹر حیدر علی خاں،

www.urduacademyts.com

ڈاکٹر وینکٹ چندر، ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر کے این واگھرے وغیرہ۔ کتنے نام لکھوں، 36 سالہ دور عثمانی میں کتنے لوگ ہیں جو بلالحاظ مذہب و ملت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ان سب کو میر عثمان علی خاں نے ایک نظر سے دیکھا، ان پر اعتماد کیا۔ہم ان کی کارکردگی کا بغور جائزہ لیں تو ہمارا سر احترام سے جھک جاتا ہے کیوں کہ یہ ہستیاں صرف امور سلطنت میں حسن انتظام کے لئے ہی قابل تعریف نہ تھیں بلکہ یہ سب محبت وخلوص کے پیکر تھے، انسانیت کے امین تھے۔

یادوں کے دریچے سے اور بھی مایہ ناز ہستیاں دکھائی دے رہی ہیں جیسے کہ چندولعل شاداب، رائن نارائن داس، نواب خورشید جاہ، رائے موہن لعل، بنی راجہ، راجہ مرلی منوہر، غلام علمبردار، نہ جانے کتنے روسا اور اکابرین نے مل کر ایسا سماج، ایسا تمدن بنایا تھا کہ یہ کہنا محال تھا کہ ایک حیدرآبادی یہاں تک ہندو، یہاں تک مسلمان ہے۔یکجہتی اور مذہبی رواداری کے یہ لوگ ایسے حسین مرقعے تھے کہ ان کی یاد دل کی کلی کھلا دیتی ہے۔بادشاہ وقت نے صرف اپنے ملک کے قابل افراد کی ہی نہیں بلکہ غیر ملکیوں کے ساتھ بھی مذہبی رواداری کا ثبوت دیا۔گھورناتھ چٹوپادھیا کو نظام کالج کا پرنسپل بنایا۔ان کی بیٹی سروجنی ایک ذہین طالبہ تھیں، ان کو محبوب علی پاشاہ نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا، بعد تعلیم مکمل کرنے تک سارا خرچہ صرف خاص سے عثمان علی پاشاہ نے دیا۔ہمیشہ بیٹی کہا، وہ شادی کے بعد سروجنی نائیڈو ہوگئیں۔ان کے بھائی ہرچند چٹوپادھیائے کو اعلیٰ عہدہ دیا۔ان کے انتقال کے بعد بیوہ کو پوار وظیفہ اور بچوں کی تعلیم کا الاؤنس جاری کیا۔

الغرض میر عثمان علی خاں نے انتہائی سادہ زندگی بسر کی۔اپنی اولاد کے علاوہ رشتہ داروں، غریبوں، بیواؤں، یتیموں، بیماروں، طالب علموں کے لئے مختلف ٹرسٹ بنائے جن سے ضرورت مند فیضیاب ہوتے رہے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔حیدرآباد کے ماضی پر نظر ڈالیں تو دکھائی دے گا کہ مسلمان نواب، برہمن، کائستھ، چھتری، پارسی، عیسائی، سکھ خاندان کے امراء یکساں تزک واحتشام کے ساتھ رہتے تھے، اسی لئے یہاں کا تمدن گنگا جمنی کہلانے لگا۔یہ سب نتیجہ تھا میر عثمان علی خاں کی اعلیٰ ظرفی کا، روشن دماغی اور کشادہ دلی کا۔ان کا یہ حال تھا کہ انہوں نے محکمہ امور مذہبی قائم کیا تھا صرف اسی مقصد کے لئے کہ مختلف فرقوں، طبقوں کی روحانی، مذہبی اور اخلاقی تربیت کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں۔بلاشبہ آصف سابع میر عثمان علی خاں کا دور مملکت آصفیہ کا سنہرا دور تھا۔رواداری، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی اس کا اصول تھا۔ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب ایک بے مثال حیثیت رکھتی ہے۔ان کے استاد فصاحت جنگ جلیلؔ نے کس خوب صورتی سے اپنے اس شعر میں میر عثمان علی خاں کی محبت کو سمیٹ لیا ہے:

دولت کے تمکنت کے، حشم کے عروج کے
کتنوں کے ہاتھ ہیں شہہ عثماں کے ہاتھ میں

☆☆☆

مکان نمبر: 119، روڈ 13A، بنجارہ ہلز، حیدرآباد۔ 500 034
فون نمبر: 040-23396324, 9908186470

گوشہ نظام سابع

www.urduacademyts.com

میر عثمان علی خان کی شاعری

زبانِ شمع سے سنتا ہوں قصہ سوزِ الفت کا
شب آخری ہو گئی لیکن ابھی ہے داستاں باقی
گل دریحاں و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پہ رہ گئی آہ و فغاں باقی
سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یارانِ رفتہ کا
غنیمت ہے جو اب تک ہے نشانِ کارواں باقی

شب آخر ہو گئی لیکن اس درد بھرے نغمے کے خالق آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں کی داستاں بے شک باقی ہے اور باقی رہے گی گل وریحان و سنبل کی زباں پر ہو کہ بلبل ناشاد کی آہ و فغاں میں یا زبان شمع پر، دل کی گہرائیوں سے ہم دکن کے وفا شعار و غم خوار اپنے اس رفیع المرتبت بادشاہ اور فقیر منش انسان کی خدمت میں گل ہائے عقیدت پیش کرتے رہیں گے۔ اس تاریخ ساز عظیم حکمران کے قدموں کے نشان کاروان حیات میں اس کی اعلیٰ حوصلگی، سلامت روی، وقار و تمکنت، فراست و تدبر، خلوص و محبت اور سادگی اور رواداری کے قصے ہمیشہ دہراتے رہیں گے۔

سلطنتیں بنتی اور مٹتی ہیں، شہنائیاں بام عروج پر پہنچتی اور فنا ہو جاتی ہیں لیکن ان کے تاثرات وروایات، تہذیب و تمدن، ان کے نقوش و جلوے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سلطنت آصفیہ کے اس آخری تاج دار کے کارہائے نمایاں جدید حیدرآباد کے اس معمار کا نام اس کی مثالی علم پرستی، تنظیمی صلاحیتیں، غربا نوازی اور رعایا پروری تاریخ کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ آصف سابع کا ۳۶ سالہ دور حکمرانی مملکتِ آصفیہ کا ایک سنہرا باب رہا ہے۔ دکن کی گنگا جمنی تہذیب اور باہمی اتحاد و خلوص دور عثمانی کا قابل قدر ورثہ رہا ہے جس پر تاریخ دکن ہمیشہ ناز کرتی رہے گی، جو سربلندی، عظمت و افتخار دور عثمانی کو نصیب تھا ان کے پیشروؤں میں کسی کو نصیب نہ ہو سکا تھا۔ اس کا احساس خود میر عثمان علی خاں کو تھا:

کچھ ایسی رفعت و شوکت ہو تیری آصف سابعؔ
بجائے آسماں نوبت ترے نقار خانے کی
عیش و عشرت کی ہے جو دھوم دکن میں عثماںؔ
سب یہ کہتے ہیں ترے بخت کی بیداری ہے
زمانہ کہتا ہے بے لاگ عثماںؔ
ہر اک کو آس ہے تیرے ہی در سے

باوجود اس دبدبے کے میر عثمان علی خاں نے سطوت و جلالت کے سایے میں کسر نفسی اور دولت و حشمت کی چوکھٹ پر فقیری کی شان رکھی۔ ایک سیدھا سادہ پرخلوص انسان جو دنیا کے ہیر پھیر سے ناواقف، مصلحتوں اور ریاکاری سے دور تھا۔ اپنے خیالات کا انھوں نے یوں اظہار کیا ہے:

تمھاری عمر یوں ہی رائیگاں گزری ہے اے عثماںؔ
نہ تم کو دست غیب آیا نہ تم کو کیمیا آئی

گوشۂ نظام سابع

www.urduacademyts.com

ایک جگہ لکھتے ہیں:

اس سے بھی بدنصیب ہے عثماںؔ کوئی بھلا
جو شخص ہیر پھیر میں دنیا کے رہ گیا

عثماںؔ ہمارا رنگ بدلتا کبھی نہیں
پابند اپنی وضع کے اپنے چلن کے ہیں

تو جانتا ہے ان کو مطلب کے ہیں یہ عثماںؔ
اغیار سے تو ہر آں ہشیار رہا کرنا

عثماںؔ تو کر چکا ہے ہزاروں کا امتحاں
بے شرم ہوں جو کہ ایسے بہت کم بشر ملے

سرزمین دکن صدیوں سے شعروادب کا گہوارہ بنی رہی۔ اعلیٰ حضرت کا کلام اس تاریخی ورثے کی کڑی ہے۔ شاعری میر عثمان علی خان کو ورثے میں ملی تھی۔

آصف جاہ اول اور ان کے فرزند جانشین ناصر جنگ شہید ناصرؔ اور خود میر محبوب علی خاں آصفؔ آصف سادس سب اس میداں کے شہسوار رہے ہیں۔ چناں چہ اس علمی اور ادبی اور شعری ماحول میں آصف سابع سخن سنجی اور سخن دانی سے کیسے دور رہ سکتے تھے۔ عثمانؔ تخلص کرتے جلیل مانک پوری سے اصلاح لیا کرتے (جنھیں بعد میں فصاحت جنگ کا خطاب عطا کیا گیا تھا) آپ کی سخن روی کے چرچے ہوئے تو ملک اور بیرون ملک کے شعرا اور ادیب دکن کی طرف کھنچے کھنچے چلے آئے۔ امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی، جلیلؔ مانک پوری تو آصف سادس ہی کے زمانے سے سرزمین دکن کے ہو رہے تھے۔ اب فانیؔ ہدایونی، یگانہ چنگیزی، جوشؔ ملیح آبادی جیسے جلیل المرتبت شاعر اس شاہی محفل کے اردگرد پروانوں کی طرح منڈلاتے نظر آئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ اور چندولال شاداں وغیرہ کو بھی ان کا قرب حاصل تھا۔

اردو سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان تھی اور شاعری اس کی آبرو۔ میر عثمان علی خاں نے اُردو کو سرپرستی دے کر حرارت و تازگی اور لطافت بخش کر اپنے عہد میں اُردو اور اُردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔

شعر کو ہم دل کے احساسات و جذبات کا اظہار وسیلہ قرار دیتے ہیں، کچھ کیفیات و واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کے بیان کے لیے ہمیں الفاظ نہیں مل پاتے۔ ایسے وقت شعر ہمارے جذبات کی ترجمانی کر دیتا ہے۔ بقول مجروحؔ:

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمے میں آ گئی

''حریم ناز کے قصے'' اور ''حدیث یار کے عنواں'' شاعری میں ڈھل کر نکلے تو بقول فصاحت جنگ جلیلؔ کے فرزند علی احمد جلیلی:

اشک ٹپکے ان کے آنکھوں سے علیؔ
میرے افسانے رقم ہوتے رہے

لیکن میر عثمان علی خاں نے دبی زبان سے کہا:

منہ سے تو ہوسکا نہ سوال زکوٰۃ حسن
حیرت زدہ میں ہاتھ کو پھیلا کے رہ گیا

میں چاہتا ہوں ان سے کہوں حالِ دل مگر
اظہارِ عشق لب پہ مرے آکے رہ گیا

اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میر عثمان علی خاں کہنے لگے:

www.urduacademyts.com

یہ حالت اپنے دل کی ہم سے اب دیکھی نہیں جاتی
تڑپنا' لوٹنا اور اس طرح مجبور ہوجانا
ذرا تم دیکھ لو ہنس کر ابھی غم بھول جاتی ہے
کوئی مشکل نہیں دل کا مرے مسرور ہوجانا
عثماںؔ کیا ہے عشق نے ایسا ہمیں تباہ
دل کو جو پوچھیے تو اک اجڑا دیار ہے

عشق کا موضوع اُردو شاعری میں ابدی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے پر پیچ راستوں میں محبت ومحبوب ازل سے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے نظر آتے ہیں۔ فرقت و وصال کی گھڑیاں بھی آتی ہیں' آنسو اور مُسکان بھی چمن میں بکھرتی ہے۔

اس دریا میں ڈوب کر نکلنے والوں کے لیے نئی منزلیں ان کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ہزاروں موضوع تغزل کا لباس پہننے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور تغزل کے وجدان میں اپنی بے چین روح کو عریاں کرتے ہیں۔

شعر شاعر کے وجود ووجدان کا اٹوٹ حصہ ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کا جُز اور اس کی فطرت کا عکس ہوتا ہے۔ ہر شاعر کی اپنی محفل ہوتی ہے' اپنا رنگ اپنا مشرب ہوتا ہے۔ میر عثمان علی خاں نے کہا ہے:

الگ ہے سب سے مرا رنگ شرب اے عثماںؔ
مرید شیخ کا ہوں میں نہ بادہ خواروں کا

شاعر خوشہ چینی بھی کر لیتا ہے لیکن اس کی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کے مختلف رشتوں سے ناتا جوڑتا رہتا ہے۔ انداز بیاں بدل لیتا ہے اور خود اعتماد کے ساتھ پرانی روایتوں کو لیے نئی راہوں پر گامزن نظر آتا ہے۔

محترم رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ میر عثمان علی خاں کی شاعری پر داغؔ دہلوی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہوسکتا ہے لیکن میرے خیال میں انھوں نے اپنی وضع داری اور انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔ زبان و بیان کا بانکپن' خود اعتمادی اور عزت نفس کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

الٰہی خیر ہو بدلے ہوئے ہیں یار کے تیور
ستم آیا' غضب آیا' بلا آئی 'قضا آئی
آنکھوں میں اثر مئے کا ہے لغزش ہے قدم میں
یہ تو کہو اس شان سے آتے ہو کہاں سے
بسر ہوئی ہے تری رات کس کی محفل میں
یہ نیند کا جو اب تک خمار آنکھوں میں
نیا یہ رنگ نکالا میری عیادت کا
وہ دیکھ کر مرے زخموں کو مسکراتے ہیں
ہماری جان گئی تیری دل لگی ٹھری
سکھایا کس نے ادا کو تیری قضا ہونا
چھوٹے گا دست شوق نہ رُخ پر ترے نقاب
رہنے نہ دے گا دل مرا تجھ کو حجاب میں
شوخی بھی ہے' ادا بھی ہے' شرم و حجاب بھی
کیا کیا بھرے ہیں سحر تمھاری نگاہ میں
ناز و ادا سے آپ کا آنا تو دیکھئے
تعظیم کو کھڑی ہے قیامت بھی راہ میں

www.urduacademyts.com

میر عثمان علی خاں کی تحریر پاکیزہ اور شستہ ہے جس میں وہ اپنی خوشیاں، اپنے غم، اپنے اندیشے، اپنی محرومیاں، اپنا فلسفۂ حیات اور اپنی دلی کیفیات عشق و محبت نہایت ہی شریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی فکر متوازن، شائستہ اور سنجیدہ ہے۔ بے تکلف دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔ کلام رومانیت اور دلبری سے لب ریز ہے لیکن متانت اور شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتا ہے۔ ان کی محبت شرافت کے دائرے میں اپنے محبوب سے ناز و نیاز اور شکوہ شکایت کرتی نظر آتی ہے۔ غزلوں کی غنائیت کلاسیکی تغزل کا ورثہ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

فرش زمیں پہ گرتے ہی دی اشک نے صدا
ایسی جگہ نہ جائے جہاں آبرو نہ ہو

آہ و فغاں سکھائی دلِ بے قرار کو
آنکھوں کو اپنی ہم نے گہر بار کردیا

انداز یہ ستم کے تجھے تھے کہاں نصیب
میری وفا نے تجھ کو جفاکار کردیا

ہچکیاں آنے لگیں کس لیے بیٹھے بٹھائے
شاید اس بھولنے والے نے مجھے یاد کیا

یہ ادائیں، یہ کرشمے، یہ غضب کے انداز
نظر آتے ہیں مری جان کے خواہاں کیا کیا

فصلِ گل میں بھی فسردہ ہی رہا دل اپنا
کبھی شاداب نہ یہ نخل تمنا دیکھا

سیدھی سادی زبان عام فہم الفاظ اور دل نشین پیرائے میں کس خوبی سے دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزل کے ساتھ قطعہ، منقبت، سلام، حمد و نعت اُردو اور فارسی میں ٹھمری ہندی زبان میں لکھی۔ ہندی کلام میں بھی وہی مہک ہے جو اُردو فارسی کلام میں پائی جاتی ہے، باوجود سلطنت کی بے انتہا مصروفیتوں کے انھوں نے شاعری کو گلے سے لگائے رکھا۔ شاید اس کافر ادا کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

اُردو کی اس کافر حسینہ جسے عرف عام میں غزل بھی کہتے ہیں، اپنے روایتی انداز مضامین کے ساتھ رنگ برنگی جلو سے بکھیرتی نظر آتی ہے۔ احساس و ادراک کے کئی مسائل، تصوف و عرفان کے کئی نکتے اس میں جلوہ گر رہتے ہیں۔

عثمان علی خاں نے اسے اسی روایتی انداز سے چاہا اور برتا ہے اور اس کے محافظ بن کر اسے مسند ذیشان پر متمکّن کردیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کی قدرت کی یہ نیرنگی چمن میں دیکھنا
گل کو جب خنداں کیا، شبنم کو گریاں کردیا

سمجھنے میں قاصر رہی کیا راز ہے اس میں
ہنسی غنچوں کی گلشن میں کوئی سمجھا تو میں سمجھا

نہیں آساں کہ واقف ہو کوئی اس راز پنہاں سے
کہ دنیا میں مقامِ آدمی سمجھا تو میں سمجھا

مرا سینہ ہے مطلع آفتابِ نورِ عرفاں کا
چراغِ طور ہے ہر ذرّہ ذرّہ اس بیاباں کا

گوشۂ نظام سابع

www.urduacademyts.com

یہ کس کی چشمِ مست نے فتوی سنادیا
جو پارسا تھے آج وہ مئے نوش ہوگئے
عثماںؔ بھری تھی آگ جو دل میں شبِ فراق
ایسے جلے کہ آپ ہی خاموش ہوگئے

خدا جانے کیوں محبوب سے ہر شاعر کو شکایت رہتی ہے اور تجاہل و تغافل سے وہ دل برداشتہ رہتا ہے۔ میر عثمان علی خاں کا دراز قد، گھنیری زلفوں والا محبوب بھی کچھ اس قدر منچلا اور الھڑ ہے کہ وہ پیمان وفا کرتا ہے نہ ہی عثمان علی خاں کی وفا شعاری کا اسے کچھ احساس ہے۔ اس کا حال عثمان علی خاں ہی کی زبانی سنیے۔

نہ آیا اور کچھ ہم کو اگر آئی وفا آئی
مگر ہاں تجھ کو اے ظالم ستم آیا جفا آئی
الٰہی خیر ہو بدلے ہوئے ہیں یار کے تیور
ستم آیا غضب آیا، بلا آئی قضا آئی
ہل گیا عرش میرے نالوں سے
اس کے دل کو مگر خبر نہ ہوئی
کون رویا نہ میرے رونے پر
نہ ہوئی تیری آنکھ تر نہ ہوئی
مزاج یار میں جانیے کیا اب سمائی ہے
کہ میرے روبرو میری برائی ہوتی جاتی ہے
یاد آتی ہے ظالم کی باتیں مجھے رہ رہ کر
سننا میرے شکووں کا اور خوب ہنسا کرنا
ہزار بار کہا لاکھ بار سمجھایا
کبھی نہ آپ میرے دل کا مدعا سمجھے

ہمیشہ ظلم اٹھاتے رہے مزے لے کر
کبھی نہ تیری جفاؤں کو ہم جفا سمجھے
پھر وہی طرزِ جفا وہی پیمان شکنی
چار ہی روز میں سب قول و قسم بھول گئے
کر وٹیں لے کے گزاری شبِ فرقت ہم نے
کیا غضب کرتے ہیں وعدے پہ نہ آنے والے
وصل کا وعدہ کیا ہے یار نے
منتظر بیٹھے ہوئے ہیں شام سے
نہیں کچھ اعتبار عہد و پیماں
وفا کی کیا امید اس بے وفا سے
یہ حوصلہ یہ کلیجا یہ دل ہمارا ہے
کہ بارِ عشق تمھارا ہمیں اٹھاتے ہیں
انداز یہ ستم کے تجھے تھے کہاں نصیب
میری وفا نے تجھ کو جفا کار کردیا
ایک بھی کوچۂ جاناں سے شاداں نکلا
کوئی گریاں، کوئی نالاں، کوئی حیراں نکلا
ہزار وصل کا ان سے کیا سوال مگر
نہیں نہیں کے سوا اور کچھ جواب نہ تھا
ستا کے عشق میں کیا تجھ کو مل گیا ظالم
ہمارے دل کا دکھانا کوئی ثواب نہ تھا
جب حال دل کہا ہے ملا ہے یہی جواب
کچھ اور کہیے ذکر یہ سو بار ہوگیا

www.urduacademyts.com

ایک آفت ہے ابھی سے قد بالا تیرا
نوجوانی میں یہ قامت بھی قیامت ہوگی

واں کھلیں شانے پہ اور یاں اتر آئیں دل میں
تیری زلفوں کی درازی سے پریشان ہوں میں

اور پھر اس غلط فہمی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں:

ہم جانتے ہیں شرم و حیا کا بہانہ ہے
دل میں ہے ان کے چور تو کیوں کر نظر ملے

عشق و محبت، باز و داد اور شکوہ شکایت کی رنگین وادیوں سے نکل کر جب ہوش و خرد کے دربار میں پہنچتے ہیں تو یہاں کے رنگ کچھ اور نظر آتے ہیں۔ عالم و فاضل، شاعر و ادیب سب حیدرآباد میں چلے آتے ہیں۔ حیدرآباد علوم وفنون کا مرکز بنا ہو ہے۔ اس کا ذکر میر عثمان علی خاں نے یوں کیا:

علومِ مشرقی کی آج عثماںؔ
توجّہ نے تیری وقعت بڑھادی

اعلیٰ حضرت کے دورِ حکومت میں سارے مذاہب باہمی پیار اور انسانیت کے رشتے میں منسلک تھے۔ خود بے تعصب بادشاہ بلا لحاظ مذہب و ملّت اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرتے ۔ مذہبی تقاریب کے موقعوں پر انہیں مبارک باد بھجواتے اور ان کی خوشیوں میں ساتھ رہتے ۔ ''نوروز'' کے موقع پر پارسیوں کے لیے انھوں نے یہ قطعہ قلم بند کیا:

آج دنیا میں جو نوروز ہوا
حق میں ہر ایک کے فیروز ہوا
شام غربت یہی کہتی ہے سنو
نیک ساعات کا یہ روز ہوا

مسلمانوں کے لیے ''عید'' کے موقع پر انہوں نے مبارک باد بھجوائی:

قدسیوں کی یہ صدا آتی ہے پیہم عثماںؔ
عید کا روز ہے یہ مژدہ مسلمانوں کو

''ہولی'' کے رنگین ماحول میں ہندی میں انھوں نے اپنی ہندو رعایا کے لیے کہا:

گلناری مَیں کو مارت ہے پچکاری
گاگر میں کیسا رنگ بھرا ہے
وہ بھی کھرا زنگاری
سانؔع پیا تو رے نین رسیلے
وار لگا ایسا کاری

عثمان علی خاں کا کلام تین دواوین پر مشتمل ہے جن میں ہمیں ہر رنگ کا شعر نظر آتا ہے۔

☆☆☆

اقتباسات از کتاب: میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد
مصنف: طیبہ بیگم

روزہ ڈھال ہے

عبداللہ بن مسلمہ، مالک، ابوالزناد، اعرج، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے، اس لیے نہ تو بری بات کرے اور نہ جہالت کی بات کرے اگر کوئی شخص اس سے جھگڑا کرے یا گالی گلوچ کرے تو کہہ دے میں روزہ دار ہوں، دوبار کہہ دے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے وہ کھانا پینا اور اپنی مرغوب چیزوں کو روزوں کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اور میں اس کا بدلہ دیتا ہوں اور نیکی دس گنا ملتی ہے۔

صحیح بخاری: جلد اول: حدیث نمبر 1789

گوشۂ نظام سابع

www.urduacademyts.com

نواب میر عثمان علی خان بہادر، نظام ہفتم، حیدرآباد
حیات اور کارنامے

دنیا کے اَمیر ترین غریب پرور بادشاہ کے طور پر اگر کسی کا نام واضح طور پر سامنے آتا ہے تو وہ ہیں حضورِ نظام نواب میر عثمان علی خان بہادر، ساتویں حکمرانِ دکن جنہیں دنیا کے نمبر 1 رسالہ TIMES (February 22, 1937 | Vol. XXIX No. 8) نے سرِ ورق تصویر شائع کرکے دنیا کا امیر ترین شخص قرار دیا تھا۔ جی ہاں 22/فروری 1937ء کے ٹائمس رسالے میں اس بادشاہ کے تعلق سے یہ بات شائع ہوئی تھی جو (900) کروڑ کے ہیرے کو پیپر ویٹ Paper Weight کے طور پر استعمال کرتا تھا، جو بادشاہت سے ہٹ جانے کے بعد بھی چین سے جنگ کے وقت ہندوستان کی فوجی امداد کے لئے 5 ٹن سونا دے سکتا ہو اور جس کی دولت کا آج تک بھی اندازہ نہیں لگایا جاسکا۔ دنیا کے امیر ترین بادشاہ جس کے خزانے میں اَربوں کی دولت ہو اور بیرونی ممالک کے بنکوں میں بھی بے پناہ دولت ہو، جس نے صرف ایک بینک NETWEST میں جو انگلینڈ کا بینک ہے، اُس میں 1,07,744.09 پونڈ (ایک لاکھ سات ہزار سات سو چوالیس پونڈ اور 9 شلنگ جمع کرائے ہوں، ایسے امیر ترین بادشاہ کی غریب پروری، اِنکساری، سادہ لَوحی، ملنساری، ہمدردی اور رعایا پروری کے بارے میں کچھ بھی لکھنے سے قلم قاصر ہے۔ میں نے اس مختصر مضمون کے ذریعہ ان کی حیات اور کارناموں پر جامع نظر ڈالنے کی جسارت کی ہے:

☆ پیدائش : 6/اپریل 1886ء، بمقام پرانی حویلی، حیدرآباد دکن۔

☆ والد محترم : نواب میر محبوب علی خاں نظام ششم

☆ والدہ : امتہ الزہرا بیگم

☆ **تخت نشینی:** (ساتویں نظام) 18/ستمبر 1911ء۔

☆ اولاد : اعظم جاہ بہادر، معظم جاہ بہادر۔

☆ پوترے : آٹھویں اور آخری نظام مکرّم جاہ بہادر۔ مفخم جاہ بہادر۔

☆ سقوطِ حیدرآباد: بادشاہت کا اختتام۔ 17/ستمبر 1948ء کو حیدرآباد کا ہندوستان میں انضمام ہوا۔ 37/سالہ دورِ حکومت رہا۔

☆ وفات : 24/فروری 1967ء (بعمر 78 سال)

فلاحی کام ۔ تعمیرات:

حضور نظام کے دور میں رعایا بے حد خوش تھی ۔ حضور نظام ہندو اور مسلم دونوں کیلئے اپنی دو آنکھوں کی تشبیہ دیتے تھے ۔ ان کے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد تھے جو تمام اُمور کی دیکھ بھال کرتے تھے ۔ بیشمار لوگوں

www.urduacademyts.com

کوحضور نظام کی ذاتِ مبارک سے فائدہ پہنچا۔ وہ رعایا پرور بادشاہ تھے۔ عوام کی فلاح و بہبود کے علاوہ ایک بہترین اڈمنسٹریٹر Administrator کی صلاحیتیں رکھتے ہوئے کئی شعبہ قائم کئے اور بیشمار عمارتیں اورتعمیراتی کام کئے۔ سڑکیں، تالاب وغیرہ بنائے۔ بے انتہا دولتمند ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے دستانے اور معمولی کپڑوں میں زندگی گذاری۔ ہر وقت اپنی رعایا کی فکر کرتے رہے۔ ان کے چند کارنامے یہاں پر درج کئے جارہے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

۱) دنیا کی پہلی اُردو زبان کی جامعہ عثمانیہ کا قیام۔
۲) اُردو زبان کو سرکاری زبان کے طور پر دفاتر میں ترقی دی گئی۔
۳) ٹکسال کا قیام، سکّہ عثمانیہ اور کرنسی کا استعمال۔
۴) حکومت کی فوج Ist اور 2nd لانسر کا قیام۔
۵) ریلوے کا قیام، ریلوے اسٹیشن کی تعمیر۔
۶) روڈ ٹرانسپورٹ RTC (بسوں) کا جال بچھایا گیا، بس ڈپوز کا قیام عمل میں لایا گیا۔
۷) Deccan Airway ایرویز، ہوائی جہاز اور ایرپورٹس کی تعمیر۔
۸) انڈسٹریل فنڈ کا قیام۔
۹) نظام شوگر فیکٹری کا قیام۔
۱۰) پیپر (کاغذ) مل کا قیام۔
۱۱) سمنٹ فیکٹریز کا قیام۔
۱۲) عثمانیہ آبزویٹری Osmania Observatory کا قیام۔
۱۳) عدالتوں، محکمہ پولیس اور دیگر محکمہ جات کا قیام۔
۱۴) آثار قدیمہ/آرکیالوجی کے محکمہ کا قیام۔
۱۵) محکمہ مال/محکمہ زراعت اور دیگر محکموں کا قیام۔
۱۶) Credit Socities کریڈٹ سوسائٹیس کا قیام۔
۱۷) SBH اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کا قیام۔
۱۸) نظام آرتھوپیڈک دواخانے کا قیام، جوکہ ان کی معزولی کے بعد 1967ء میں نظام چیریٹبل ٹرسٹ کی تحت قائم کیا گیا جس کو اسٹیٹ کی حکومت نے NIMS کے نام سے بدل دیا اور آج یہ تلنگانہ کا سب سے بڑا Pride گورنمنٹ ہاسپٹل ہے جس کا پورا نام دی نظام انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اس ہاسپٹل کے لئے اسپیشلسٹ ڈاکٹر رنگاریڈی کو اپنے خرچ سے انگلینڈ میں اسپیشلائزیشن کیلئے بھیجا اور واپسی پر اس ہاسپٹل کا ڈائرکٹر بنایا۔
۱۹) نظام چیریٹیبل ٹرسٹ کا قیام جس میں غریب طلباء کی امداد کا عمل آج تک جاری ہے۔ اور آج بھی ہر سال کم از کم 2000 طلبہ کو بلالحاظ مذہب و ملت تعلیمی وظیفہ دیا جاتا ہے۔

محلات اور عمارتوں کی تعمیر:

۱) شاہی محل) کنگ کوٹھی۔
۲) خلوت محل/ چومحلّہ پیالس
۳) دارالشفاء/عزاخانہ زہرہ
۴) ایوانِ اسمبلی
۵) سکریٹریٹ
۶) جوبلی ہال
۷) جاگیردار کالج
۸) ٹاؤن ہال

www.urduacademyts.com

۹) حیدرآباد میوزیم

۱۰) انڈسٹریل میوزیم

۱۱) عثمانیہ یونیورسٹی

۱۲) عثمانیہ ہاسپٹل

۱۳) عثمانیہ عدالت (ہائی کورٹ)

۱۴) ملٹری ہاسپٹل

۱۵) سکندرآباد ریلوے جنکشن

۱۶) حیدرآباد (نامپلی) ریلوے اسٹیشن

۱۷) کاچیگوڑہ ریلوے اسٹیشن

۱۸) معظم جاہی مارکٹ

۱۹) کتب خانہ آصفیہ

۲۰) محبوبیہ گرلس اسکول

۲۱) گن فاؤنڈری

۲۲) عالیہ اسکول

۲۳) دہلی میں حیدرآباد ہاؤز

۲۴) مکّہ مدینہ میں رباطیں

ان کے علاوہ بے شمار عمارتیں، چھوٹے چھوٹے محلّوں کو پلاننگ کے ساتھ نئے مقامات پر بنایا گیا۔

حضور نظام کے امدادی کام:

۱) مکّہ مدینہ میں Electricity کا اپنے صرف خاص سے انتظام۔

۲) حرم مکّہ و حرم مدینہ میں پنکھوں کا انتظام۔

۳) بے شمار مندروں کی اِمداد/ چرچوں کی اِمداد۔

۴) بنارس ہندو یونیورسٹی کی اِمداد۔

۵) بے شمار مساجد کی امداد۔

۶) جامع مسجد دہلی کے فرش کی تجدید کیلئے اِمداد۔

۷) حکومت ہند کو 500 ٹن سونے کی امداد چین سے جنگ کیلئے۔

۸) علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی امداد۔

۹) جامعہ نظامیہ کا قیام اور اس امداد۔

۱۰) دارالعلوم دیوبند کی مالی امداد۔

ہزاروں لوگوں کو روزگار سے مربوط کیا گیا۔ رعایا کافی خوش تھی۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب حضور نظام کے پاس برابر تھے۔ ہر ایک کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی تھی۔ اَربوں روپیوں اور جائیداد کے مالک ہونے کے باوجود سیدھی سادھی زندگی گذارنے والے ہردلعزیز حکمراں کا 24/ فبروری 1967ء کو انتقال ہوا تو نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان اور ساری دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ جنازہ میں سروں کا سمندر نظر آنے لگا۔ حکومت نے سرکاری عمارتوں پر جھنڈے نیچے کردیئے اور تعطیل کا اعلان کیا۔ آپ کی وصیت کے مطابق مسجد جودی کنگ کوٹھی میں (حضور نظام کی لڑکے کی یاد میں تعمیر کردہ مسجد جس کا نام جواد تھا) اُن کی والدہ زہرہ بیگم کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ آج ہمارے بیچ حضور نظام سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر نہیں رہے لیکن وہ ہمارے دلوں میں بستے ہیں اور آنے والی نسلیں اُنھیں محسن دکن و محسنِ ہند کے طور پر ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ بلالحاظ مذہب و ملت کے خادم اور سچے محبِّ وطن حضور نظام نواب میر عثمان علی خان بہادر کی مغفرت فرمائے اور جنت میں ان کے درجات بلند کرے۔ آمین

☆☆☆

مکان نمبر: 12-2-823/A/12/A، سہیل منشن،
سنتوش نگر کالونی، مہدی پٹنم، حیدرآباد۔
فون نمبر: 9246524163, 8309507484

www.urduacademyts.com

علامہ اقبال کی ڈائری کے چند اندراجات

ہر بڑا آدمی یادداشت کے طور پر کچھ اہم نوٹس ایک ڈائری میں لکھتا ہی ہے۔ خاص طور پر سفر کرتے ہوئے تاریخی مقامات کی تفصیلات یا غیر معمولی واقعات اور قابل ترین شخصیات سے ملاقات اور کوائف لکھنا پڑھے لکھے لوگوں کا معمول ہے۔ اس قسم کی یاد داشتیں بعد میں مضمون رپورتاژ وغیرہ میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ بعض نادر و نایاب کتابوں، رسائل و جرائد کے حوالے سے بڑی قیمتی معلومات پڑھنے میں آتی ہیں تو صاحبانِ ذوق ایک بیاض ر ڈائری میں درج کرلیتے ہیں۔ علامہ اقبال بھی اپنے مشاہدات و تجربات اور اپنے مطالعے کا نچوڑ نوٹ کرلیا کرتے تھے۔ علامہ اقبال کی ڈائری کے سوا سو (125) نوٹس انگریزی میں دریافت ہوئے جنھیں اقبال نے Stray Reflections کے نام سے لکھ رکھا تھا۔ اقبال سے پہلے رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی اس طرح کے مختلف نوٹس لکھے تھے جو Stray Birds کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال کے 1910ء سے لکھے ہوئے نوٹس Stray Reflections کا اردو ترجمہ ''شذراتِ فکرِ اقبال'' کے نام سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کیا جنھیں دسمبر 1961ء میں لاہور سے اقبال کے فرزند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے شائع کروایا۔ اس کا ایک اور ایڈیشن 1973ء میں بھی لاہور ہی سے شائع ہوا۔ علامہ اقبال کے مذکورہ سوا سو 125 نوٹس کا اردو ترجمہ ہندوستان میں ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے دہلی یونیورسٹی سے 1975 میں ''بکھرے خیالات'' کے نام سے شائع کیا۔ Stray Reflections میں علامہ اقبال نے بعض اہم شخصیات پر اپنے تفصیلی جذبات کا اظہار بھی کیا ہے۔ جیسے اورنگ زیب عالم گیر کے تعلق سے متعصب ذہنوں نے جب منفی خیالات کا اظہار کیا تو اقبال نے اپنی ڈائری میں تفصیلی طور پر اپنے مخلصانہ جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہوئے اور تعصب کی مذمت کرتے ہوئے لکھا تھا:

The political genius of Aurangzeb was extremely comprehensive.

علامہ اقبال کی ملاقات عالمی شخصیات سے رہی۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ شخصی، قومی و ملی احساسات و جذبات پر اقبالؔ نے اپنی فکر پیش کی۔

علامہ اقبال نے 9/فروری 1911ء (یعنی نو دو گیارہ) کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں ایک (خطبہ) لکچر The Muslim community, A sociological study (ملتِ اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ) کے عنوان سے دیا تھا۔ یہ خطبہ بھی ایسے نوٹس پر مشتمل تھا جو اقبال کے ذہن میں پک رہے تھے۔ وہ چند جملے جو اقبال کی ڈائری Stray Reflections میں درج تھے وہ لکچر کا روپ دھار گئے۔

www.urduacademyts.com

چارلس رابرٹ ڈارون (Darwin) (1809-1882) کی مشہور زمانہ کتاب Origin of Species میں اس نے انسان کا بندر کی اولاد ہونے کا نظریۂ ارتقا پیش کیا جس سے اتفاق لازمی نہیں مگر اس نے اک نظریہ یہ بھی پیش کیا تھا جو قابل غور ہے۔ ''زیادہ اہل اور قوی جاندار ہی زندہ رہتا ہے اور کم زور ختم ہوجاتے ہیں''۔ Survival of Fittest کا یہ نظریہ بھی قرآن مجید نے رد کردیا۔ عاد و ثمود جیسے طاقت ور افرادِ قوم اپنی طاقت و صلابت کے بل بوتے پر گھمنڈ نہ کرسکے۔ ملیامیٹ کردیئے گئے۔ البتہ اقبالؔ نے ڈارون کے اس نظریہ کے حوالے سے اپنی قوم کو کم زوری کے بجائے طاقت کی ترغیب دی۔ اپنی ڈائری میں اقبالؔ نے لکھا:

''ایک علیل (بیمار) معاشرتی عضویہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو مجتمع کرلیتا ہے جو اس کی صحت کی حفاظت کا رجحان رکھتی ہیں۔

مثلاً ایک عظیم شخصیت پیدا ہوتی ہے جو ایک نصب العین کے انکشاف سے قریب المرگ عضویے کو نئی توانائی بخشتی ہے''۔

(شذراتِ فکر اقبال۔ مترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صفحہ 35، دسمبر 1973 لاہور)۔ یہ قدرتی نظام ہے کہ بدن میں بھی دفاعی صلاحیت خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔

علامہ اقبالؔ نے مشرق و مغرب کے تمام مفکرین سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی فراست کی بات کو مومن کا کھویا ہوا خزانہ سمجھ کر قبول کیا اور ان کے غلط نظریے کو اقبالؔ نے رد بھی کیا ہے۔ واضح رہے کہ رد و قبول کا یہ اختیار اقبالؔ ہی تک محدود نہیں۔ ہر صاحبِ فہم و ادراک کو یہی روش اختیار کرنی چاہیے۔ بھلے ہی اس کی زد میں خود اقبالؔ ہی کیوں نہ آتے ہوں۔ بقول راقم:

''ہر بات مان لینے کی عادت خراب ہے۔
نا قابلِ قبول کو رد بھی کیا کرو''۔

نطشے (Nietsche) (1844-1900) مشہور جرمن فلسفی جو مذہب کا سخت مخالف تھا بلکہ اخلاقیات کو بھی وہ ناپسند کرتا تھا کہ اخلاقیات بھی مذہب ہی کی زائدہ ہوتی ہے۔ اس کے نظریے کے مطابق انسان ارتقاء کی منازل طے کرکے فوق البشر Superman ہوجاتا ہے۔ اسی کے لیے اقبالؔ نے کہا تھا:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اس کے باوجود علامہ اقبالؔ نے نطشے کے نظریۂ ارتقا سے استفادہ کرتے ہوئے ہی تو یہ کہا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اللہ نے بنا بنایا نوالہ کبھی نہیں دیا اور جب بنا بنایا نوالہ منّ و سلویٰ کے روپ میں دیا تو قوم بنی اسرائیل نے اس کی ناقدری کی۔ پیاز لہسن دالیں مانگیں، نتیجتاً اللہ نے اس ناشکری قوم سے وہ عنایت اٹھالی اور اُن سے کہا کہ جاؤ کھیتی باڑی کرو، اگاؤ اور اپنی پسند کی ناپسندیدہ چیزیں کھاؤ۔ نطشے کا

www.urduacademyts.com

نظریہ ہے:

''لوگوں کی بقا کا دارو مدار نئی اقدار کی مسلسل تخلیق پر ہے۔ اشیاء یقیناً تخلیقِ ربانی ہیں مگر ان کے معانی تمام تر انسانی ہیں''

اس نظریہ کو بنیاد بنا کر اقبالؔ نے اپنی ڈائری میں لکھا: ''خدا نے اشیاء تخلیق کیں اور انسان نے اشیاء کی اقدار (Values)''

اسی سے ملتا جلتا خیال برگساں کا ہے کہ ''قدرت کی صناعی پر انسانی کاری گری اک حسن اضافی ہے''

علامہ اقبالؔ نے اس نظریے کو بڑے سلیقے سے شعری روپ دیا۔ دیکھیے کیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے:

توشب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

لالۂ طور (پیامِ مشرق) کے ایک قطعے میں بھی یہی خیال اک الگ انداز میں آیا ہے:

نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید، ایں خوب تر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

خاکسار رؤف خیر نے اس کا ترجمہ جو یوں کیا ہے تو اقبالؔ کے منشا کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے:

ہے خود ہی ساز، سُر سنگھار آدم
ہے خود ہی راز، خود اظہار آدم
کرے تخلیق پر حسنِ اضافی
ہے خالق کا شریکِ کار آدم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نودو گیارہ کو علامہ اقبالؔ نے ملتِ اسلامیہ کے تعلق سے جو لکچر دیا تھا اس کا بنیادی نکتہ اقبالؔ کی ڈائری Stray Reflections میں یوں درج ہے:

''قومیت کا تصور یقیناً'' قوموں کی نشو ونما میں ایک صحت مند عامل (Healthy Factor) کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جذبۂ قومیت مائل بہ افراط ہوتا ہے اور جب یہ حد سے متجاوز ہو جاتا ہے تو اس میں فن اور ادب کے وسیع تر انسانی مقاصد کو ختم کر دینے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔''

اقبال کی ڈائری کا یہ نوٹ ایک سو سال پہلے کا لکھا ہوا ہونے کے باوجود آج کے حالات پر صادق آتا ہے۔ آج یہ جذبۂ قومیت اس حد تک مائل بہ افراط اور حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔ فن اور ادب کے وسیع تر انسانی مقاصد کو ختم کر دینے کا رجحان یہاں تک پیدا ہو چکا ہے کہ بڑی سے بڑی عدالت کے فیصلے کے اثر انداز ہونے کا امکان کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ ''نیا شوالہ'' لکھنے والے شاعر اقبالؔ نے مذکورہ لکچر میں (نودو گیارہ) کو کہا تھا:

www.urduacademyts.com

''میرے نزدیک حب الوطنی کا جذبہ جسے تصور قومیت ابھارتا ہے، اک طرح سے مادیت پرستی ہی ہے جو اسلام کی روح کے بالکل منافی ہے۔ کیوں کہ اسلام بت پرستی کی تمام لطیف وکثیف اقسام کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر نمودار ہوا ہے۔''

اقبالؔ کی ڈائری Strays Reflections (بہ حوالہ شذراتِ اقبالؔ صفحہ 83) میں ہے:

''اسلام کا ظہور بت پرستی کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وطن پرستی بھی بت پرستی کی ایک نازک صورت ہے۔ مختلف قوموں کے وطنی ترانے میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی ایک مادی شئے کی پرستش سے عبارت ہے۔ اسلام کسی صورت میں بت پرستی کو گوارا نہیں کرسکتا۔''

اقبالؔ نے اسی خیال کو بعد میں اس شعر میں پیش کیا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وطن پرستی عصبیت کو جنم دیتی ہے اور عصبیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اقبالؔ اپنے لکچر میں کہتے ہیں:

''عصبیت کا سادہ مفہوم کسی کا اپنی قومیت کا شدید احساس رکھنا ہے مگر دوسری اقوام کے خلاف نفرت کے جذبات رکھنا اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے''

ایک سیکولر Secular ملک میں یہی تو ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات واحساسات و مذہب کا احترام کیا جائے۔ پُر امن معاشرہ (سماج) تبھی وجود میں آتا ہے۔ ہر شخص کو ہوا میں مُکّا لہرانے کا حق حاصل ہے مگر وہیں تک جہاں سے دوسرے کی ناک نہ شروع ہوتی ہو۔

علامہ اقبالؔ نے تہذیب اور مذہب میں فرق پر گفتگو کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا کہ اگر کسی انگریز یا فرانسیسی کے مذہب کے بارے میں کوئی ریمارک کریں تو وہ اتنا برافروختہ نہیں ہوتا' اتنا برا نہیں مانتا مگر جیسے ہی اس کے تہذیب وتمدن پر حملہ ہوگا وہ مرنے مارنے پر تل جائے گا۔ وہ اپنی تہذیب اپنے تمدن کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف مسلمان وہ چاہے دنیا کے کسی کونے میں ہو قرآن وسنت کے خلاف ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔ وہ تہذیب و تمدن کو اپنے مذہب پر فوقیت ہی نہیں دیتا۔ ہر علاقے کی تہذیب وتمدن الگ الگ ہوسکتا ہے لیکن ہر علاقے کا اسلام تو ایک ہی ہوگا۔ بقول اقبالؔ:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اس سلسلے میں اقبالؔ نے اپنے مذکورہ لکچر میں یہ بھی صراحت کے ساتھ کہا:

''اسلام ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اہم ہے۔ اس کا خاص قومی مفہوم ہے۔ اس لیے اسلامی اصول سے پوری طرح باخبر ہوئے بغیر ہماری قومی زندگی ناقابلِ تصور ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ نظریۂ اسلام ہمارا ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم رہتے ہیں، چلتے

www.urduacademyts.com

پھرتے ہیں اور اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ہر دوسری چیز سے ایسے ہی برتر ہے جیسے انگریزوں کے لیے انگلستان، جرمنوں کے لیے جرمنی۔ جس لمحے نظریۂ اسلام پر ہماری گرفت ڈھیلی پڑی، ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔'' (خطباتِ اقبالؔ۔ ترجمہ وحواشی محمد جہانگیر عالم۔ دائرہ معارف اقبالؔ، فیصل آباد نومبر 2001)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے اس واضح نظریۂ اسلام اور قومی تصور پر کیا وہ ملک کا ربند ہے جو اسی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا۔؟ ویسے اقبالؔ نے ہر اس مقام کو ابدی گھر یا وطن قرار دیا ہے جہاں نظریۂ اسلام پر کاربند قوم کا بسیرا ہے۔ اور جیسے ہی نظریۂ اسلام سے تعلق میں کمی آتی ہے قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ گویا نظریۂ اسلام اور قومیت لازم و ملزوم ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے مذکورہ لکچر میں بہت ہی صاف الفاظ میں دوٹوک انداز میں کہہ دیا:

''ملتِ اسلامیہ کا ایک فعال رکن بننے کے لیے فرد کو مذہبی اصولوں پر غیر مشروط ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اسلامی تمدن میں جذب ہوجانا چاہئیے۔''

(خطباتِ اقبالؔ۔ جہانگیر عالم)

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

علامہ اقبالؔ نے اپنی ڈائری میں اورنگ زیب عالم گیر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اورنگ زیب عالم گیر (1618-1707) اپنے وقت کا عظیم ترین بادشاہ تھا۔ ذاتی اوصاف کے اعتبار سے اس کا کردار مثالی تھا۔ وہ اسلام کا شیدائی تھا اور اس کی زندگی اتباع و ترویجِ شریعت کی ایک روشن مثال ہے۔ اس نے شریعت کے احکام کے مطابق اپنا نظام حکومت ترتیب دیا اور اس کی پوری پوری پیروی بھی کی۔ اُسے ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی قرار دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ نسلیں میرے اس قول کی صداقت کو تسلیم کریں گی۔'' (شذراتِ فکر اقبالؔ، صفحہ 99)

افسوس کی بات یہ ہے کہ نئی نسلوں کے ذہن میں اس قدر تعصب بھر دیا گیا ہے کہ وہ اورنگ زیب عالم گیر کے تعلق سے منفی سوچ رکھتی ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچر دیتے ہوئے بھی اورنگ زیب عالم گیر کے دفاع میں کہا:

''جن لوگوں کا عالم گیر کے بارے میں علم تاریخ ہند کے مغربی شارحین تک محدود ہے، وہ عالم گیر کا نام ہر قسم کے ظلم و جبر، تعصب، غداری اور سیاسی سازشوں کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں... مثالی کردار کا وہ نمونہ جس کی جھلک عالم گیر میں نظر آتی ہے، میری رائے میں حقیقی مسلم سیرت و کردار کا نمونہ ہے۔''

(خطباتِ اقبال۔ مرتبہ محمد جہانگیر عالم)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نہ صرف سرسید احمد خان کے خوابوں کی تعبیر بن کر ابھری بلکہ پوری قوم کی نیک توقعات اس سے وابستہ رہیں۔ اقبالؔ نے یہاں اپنے لکچر میں صاف

www.urduacademyts.com

صاف فرمایا:

''جدید مسلم نوجوان میں جس قسم کے کردار کا نمونہ ہم نے پیدا کیا ہے اس کی ذہنی زندگی میں اسلامی تمدن کا کوئی پس منظر نہیں۔ اس کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کو دی گئی دنیاوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقیدے کو متزلزل نہ کر دیا ہو۔ میں ڈرتا ہوں برملا کہنے سے کہ اسے مغرب کے اطوار فکر میں خطرناک حد تک رچ بس جانے اور مغربی ادب کے مستقل مطالعہ کی اجازت نے اور اپنی قوم کے اجتماعی تجربوں کے مطالعے سے کلی غفلت نے اس کی ذہنی زندگی کو یکسر نامسلمان بنا دیا ہے۔ میں بلاخوفِ تردید کہتا ہوں کہ کسی قوم نے بھی ہماری قوم سے اعلیٰ سیرت و کردار کے نمونے پیش نہیں کیے لیکن ہمارا نوجوان جو کہ اپنی قوم کی تاریخ حیات سے مایوس کُن حد تک ناواقف ہے اسے رہنمائی اور توصیف کے لیے مغربی تاریخ کی عظیم شخصیات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ذہنی اعتبار سے وہ مغرب کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح صحت مند خودی سے عاری ہے جو اپنی قوم کی تاریخ اور ادبیاتِ عالیہ کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔'' (خطباتِ اقبال۔ مرتبہ محمد جہانگیر عالم) صفحہ 34۔

اقبال نے مشرق و مغرب کی شخصیات کے فکر و فلسفہ سے استفادہ ضرور کیا مگر ان کی ذہنی غلامی کبھی قبول نہیں کی بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ ان کی فکر کی لکیر کے بالمقابل بڑی لکیر کھینچ کر دکھا دی۔

یہاں اقبال کی ڈائری Stray Reflections کے چند اندراجات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے جن کی بنیاد پر اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کے لیے بعض لکچر بھی دیئے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف خیر
موتی محل، قلعہ گولکنڈہ
حیدرآباد 008 500 (تلنگانہ)
موبائل: 9440945645

چہل قدمی کے فوائد

صحت کی رو سے دیکھا جائے تو وزن کو اعتدال میں رکھنے کے لئے ہم چہل قدمی کے لئے باقاعدہ منصوبہ بناتے ہیں۔ دن بھر کام کرنے کے لئے نشستوں پر براجمان رہتے ہیں۔ جس سے پیٹ اور اس کے اطراف چربی کی تہہ اکٹھی ہوتی ہے۔ خاص کر دفاتر میں کام کرنے والی خواتین بہت دیر تک نہ کھڑی رہ سکتی ہیں نہ گھوم پھر سکتی ہیں۔ ڈیسک ورک بہت توجہ چاہتا ہے۔ ایک مشکل اور ہے کہ بہت سے دفاتر میں ڈیسک ہی پر لنچ کھایا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ نماز کے لئے یا واش روم جانے کے لئے ہی ڈیسک چھوڑا جاتا ہے۔ اس معمول کے بعد چہل قدمی بہت ضروری ہوجاتی ہے۔ ذیل میں پڑھئے پیدل چلنے کے اہم فائدے اور آج ہی اپنے طرز زندگی میں اس سادہ سی ورزش کو شامل کرلیں۔

چہل قدمی سے یادداشت میں اضافہ ہوتا ہے، پیدل چلنے والے افراد ذہنی طور پر مستعد اور فعال رہتے ہیں۔ آپ کا دل قوی ہو جاتا ہے، فالج کا خطرہ ٹلتا ہے، دوران خون کی رفتار معتدل رہے گی۔ عورتوں کو سینے کے سرطان کا خطرہ کم ہوتا ہے، بھربھری ہڈیوں سے نجات ملتی ہے، ذیابیطس کا خطرہ دور ہوتا ہے قنوطیت، اضمحلال اور یاسیت کا خاتمہ ہوتا ہے، تھکن اور افسردگی، قنوطیت اور یاسیت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ چہل قدمی سے کبھی کوئی منفی ردعمل نہیں ہوتا۔

ماخوذ از اردو پوائنٹ، تاریخ اشاعت 31-07-2021

www.urduacademyts.com

اکبر، اقبال اور اسرار خودی

ایک ہی فن سے تعلق رکھنے والی دو یا اس سے زائد عہد ساز شخصیات جب کسی زمانے میں جمع ہوتی ہیں تو ان کے درمیان باہمی روابط کے امکانات قوی ہوجاتے ہیں اور اگر ان کا ملک و معاشرہ اور نصب العین بھی ایک ہو تو یہ امکان یقین کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اکبر اور اقبال کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، حالانکہ اکبر اور اقبال کے درمیان عمر کا تقریباً ۳۰ سال کا فاصلہ ہے لیکن عمر کے اس تفاوت کے باوجود ملک کے سیاسی و سماجی پس منظر میں فکر کی سطح پر ان کے یہاں یکسانیت نظر آتی ہے، ہاں اظہار کے طریقے ضرور الگ ہیں۔ اکبر نے اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے طنز و مزاح کا لہجہ اختیار کیا اور اس کے برعکس اقبال کے ابتدائی کلام میں اکبر کا اثر ضرور نظر آتا ہے لیکن یہ تاثر وقتی تھا جو وقت کے ساتھ ختم ہوگیا اور اقبال نے سنجیدہ اور فلسفیانہ انداز بیان کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا۔ لیکن دونوں کی فکر کا خمیر ایک ہی مٹی سے تیار ہوا تھا۔ مولانا محمد شاہ پھلواری اکبر اور اقبال کی مشترکہ فکری بنیادوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال دونوں نے اپنی اپنی جگہ ایک ہی حقیقت کو محسوس کیا۔ دونوں کے دل ایک ہی چوٹ کھا کر تڑپے۔ دونوں کے دماغ کا سودا ایک ہی تھا۔ دونوں کے قلبی احساسات نے شعر کا پیکر اختیار کیا اور دونوں نے حاکم قوم کے ایک ایک جوڑ، بند پر بھرپور وار کیے۔ دونوں کی اساس فکر اسلام اور صرف اسلام تھا۔ دونوں کے تصورات کا مرکزی نقطہ ذات رسالت مآب تھی اور امت محمدیہ ﷺ۔ ان دونوں نے محسوس کیا کہ اسلامی قدریں، اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی ثقافت مغلوب ہوتی جارہی ہے اور انگریزی کلچر چھاتا جاتا ہے۔ دونوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب کی چمک دمک مسلمان قوم کے دل و دماغ پر اس طرح مسلط ہوتی جارہی ہے کہ ان کی آنکھیں خیرہ ہوکر رہ گئی ہیں اور اسلامی اصول کو واشگاف لفظوں میں پیش کرتے ہوئے مسلمان شرماتے ہیں اور اگر پیش بھی کرتے ہیں تو معذرت خواہانہ انداز میں .... یہ سب دیکھ کر دونوں کے دل بے چین ہوگئے۔ دونوں نے مقابلے کے لیے اپنے اپنے ہتھیار سنبھالیے۔ کہیں انگریزی تہذیب پر حملے کیے کہیں انگریزی نظام تعلیم پر، کہیں غیر اسلامی تصورات کی دھجیاں بکھیریں، کہیں مغرب پرستی کے پرخچے اڑائے۔''

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر تعلیم و ترقی کے مخالف تھے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے، وہ صرف اس نظام کے خلاف تھے جو حکومت کے پردے میں ہماری تہذیبی جڑوں کو کھوکھلا کررہا تھا اور مغربی تعلیم کے نام پر ہندوستانی ذہنوں کو غلام اور دین سے بیزار کررہا تھا۔ اکبر اور اقبال دونوں نے اس عیاری کو محسوس کیا اور اپنی شاعری میں جابجا اس کا اظہار بھی کیا ہے:

اکبر الہ آبادی:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

OOO

نظر ان کی وہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

OOO

www.urduacademyts.com

مسجد سے نماز اور وظیفہ رخصت
کالج سے امام ابوحنیفہ رخصت
نہ تو مکتب سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

علامہ اقبالؔ:

گلہ تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہٰ الا اللہ

OOO

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

OOO

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ان اشعار سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اکبراور اقبالؔ تعلیم و ترقی کے خلاف نہ تھے بلکہ واضح طور پر مغرب پرستی کے مخالف تھے۔ یہاں ایک بات اور عرض کرنے کی ہے کہ ان مشترکہ فکری بنیادوں کے ساتھ ہی دونوں کے یہاں مشترکہ ہندوستانی تہذیب سے محبت بھی نظر آتی ہے۔ دونوں اسلام اور مسلمانوں کے تہذیبی و دینی انحطاط کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی قدروں کے دلدادہ بھی تھے اور مشترکہ تہذیبی قدروں کے زوال پر فکر مند بھی تھے۔

اکبراور اقبالؔ کا فکری ارتکاز تو ایک ہی ہے لیکن اس کی وسعت میں فرق ہے۔ اکبر کی فکری وسعت کا دائرہ ملک وقوم تک محدود رہا، اور اقبالؔ کی فکر اور شاعری کا دائرہ قومیت کی حدود کو عبور کر کے بین الاقوامی اور عالمی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اکبر کی شاعری موجودہ وقت میں کوئی معنویت نہیں رکھتی۔ میری نظر میں اکبر کی شاعری کی معنویت کے تعلق سے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر اکبر کی شاعری کی بصارت سے زیادہ ان کی بصیرت پر غور کیا جائے تو ان کی معنویت اپنے آپ ثابت ہو جائے گی۔ اکبر کو اس معاملے میں اولیت کا شرف حاصل ہے کہ اپنے ہم عصر شعرا میں انھوں نے اس زمانے میں مشرقی تہذیب کے زوال اور انگریزی تعلیم وتہذیب کے مضر اثرات اور مضمرات کو سب سے پہلے محسوس کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

’’میرا خیال یہ ہے کہ اکبر پہلے شخص ہیں جن کو بدلتے ہوئے زمانے، اس زمانے میں اپنی تہذیبی اقدار کے لیے خطرہ اور انگریزی تعلیم وترقی کو انگریزی سامراج کے قوت مند ہتھیار ہونے کا احساس شدت سے تھا اور انھوں نے اس کے مضمرات کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس معاملے میں مہاتما گاندھی اور اقبالؔ بھی ان کے بعد ہیں۔‘‘

ان تمام باتوں سے قطع نظر اکبر اور اقبالؔ کے مابین توانا مراسم بھی تھے۔ اقبالؔ انھیں اپنا مرشد معنوی کہتے تھے اور دونوں کے درمیان خط و کتابت کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے۔ الہ آباد میں اکبر سے اقبالؔ کی ملاقات تین مرتبہ ہوئی‘ اس کے بعد بھی اقبالؔ اکبر سے ملاقات کے متمنی تھے لیکن درمیان میں ہی اکبر کا انتقال ہوگیا۔ دونوں کی ایک دوسرے سے محبت، عقیدت اور قدر دانی کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

حضرت اقبالؔ میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جوان کے طرز کی شیدا ہوئیں

www.urduacademyts.com

یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوق معرفت
یہ طرق راستی خودداریِ بے تمکنت

یہ اشعار اکبر نے اقبال کی والدہ کی وفات پر کہے تھے۔ اقبال نے اکبر کی وفات پر یہ اشعار کہے:

دریغا بجق از جہاں بست اکبر
حیاتش بجق بود روشن دلیلے
سرِ ذرۂ طورِ معنی کلیمے
بہ بت خانۂ دور حاضر خلیلے

۱۹۱۵ء میں اقبال کی فارسی مثنوی 'اسرار خودی' کے شائع ہونے کے بعد دونوں کے درمیان تصوف کے تعلق سے اختلاف کا ایک طویل سلسلہ رہا۔ یہ سلسلہ صرف انھیں دو لوگوں کے درمیان نہیں تھا بلکہ اس دور کے تقریباً تمام اکابرین علم و دانش کے لیے بھی یہ مثنوی توجہ کا مرکز رہی۔ اور اس پر کافی لے دے بھی ہوئی۔ اس میں خواجہ حسن نظامی اور پیرزادہ مظفر احمد فضلی پیش پیش تھے خواجہ حسن نظامی اقبال کے اظہار کردہ خیالات سے کافی برہم ہوئے جس کے سبب طویل عرصے تک ان کے درمیان تقریباً تمام مراسم منقطع ہو گئے تھے۔ بعد ازاں اکبر نے مصالحت کی کوشش کی۔

اقبال ملت اسلامیہ کے احیاء کے خواہش مند، مبشر اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ وہ بنیادی طور پر حرکت و عمل کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اسرار خودی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اقبال تصوف کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ اس میں مکمل عقیدہ رکھتے تھے اور خود سلسلہ' قادریہ میں بیعت تھے۔ ابتدا میں علامہ وجودیت کے تصور سے متاثر تھے لیکن بعد میں اس سے بیزار ہو گئے۔ علامہ وحدت الوجود کو فلسفہ قرار دیتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے (اور یوں بھی جب کوئی فلسفہ مطابق شریعت و سنت ہو تبھی قابل قبول ہوتا ہے) اور فراغت، بے عملی و رہبانیت کو فروغ دیتا ہے اور اسلام میں رہبانیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اسی طرح شاعری بھی اگر انسان کو ان راہوں پر ڈالے تو وہ بھی علامہ کے نزدیک مضر ہے اور شیطان کے کام کو آسان کرنے کے مترادف ہے۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' میں ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے:

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اقبال نے دیگر علوم وفنون اور فلسفے کی طرح تصوف کے لیے بھی کچھ اصطلاحیں وضع کی تھیں۔ اقبال اس تصوف کو اسلامی تصوف کہتے ہیں جو اسلام کے اصل پیغام کا ترجمان ہے اور جو تصوف لوگوں کو رہبانیت کی جانب لے جاتا ہے اسے عجمی تصوف کا نام دیتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک:

''اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوفِ وجودی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب ہوا میں پرورش پائی ہے۔''

محولہ بالا جملے کے متعلق یہاں کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے علامہ اقبال اور تصوف کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے اس جملے کے متعلق (تحقیق کی رو سے) کئی ناقدین و محققین غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اکثر تحقیقی و تنقیدی کتابوں میں مثلاً اقبال نامہ، مجموعہ مکاتیب اقبال مرتبہ شیخ عطا اللہ، کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اقبال اور تصوف از آل احمد سرور مشمولہ دانشور

مضامین

www.urduacademyts.com

اقبالؔ اورطریق خانقاہی اورکلام اقبالؔ از پروفیسر پی۔این۔بشپ مشمولہ اقبالؔ اور تصوف مرتبہ آل احمد سرور میں اصل جملے کے بجائے سہواً کاتب کی غلطی سے سید سلیمان ندوی کے نام علامہ اقبالؔ کے مذکورہ خط مورخہ ۱۳/اکتوبر ۱۹۱۷ میں 'تصوف وجودی سرزمین اسلام میں نیا پودا ہے' کی جگہ 'تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں نیا پودا ہے' درج ہو گیا ہے، جب کہ اصل خط میں 'تصوف وجود ی سرزمین اسلام میں نیا پودا ہے' ہی درج ہے۔علامہ اقبالؔ کا دستی خط (عکس) جوکلیات مکاتیب اقبالؔ مرتبہ سید مظفر حسین برنی کے صفحہ ۶۷۵ ،طباعت ۱۹۸۹ء پر شامل ہے،اس میں صحیح عبارت ('تصوف وجودی سرزمین اسلام میں نیا پودا ہے') موجود ہے۔۴؎مذکورہ بالا کتابوں میں درج غلط جملے کو اگر مان لیا جائے تو اقبالؔ صریحاً تصوف کے منکر ثابت ہوں گے اور اقبالؔ فہمی کے تعلق سے یہ ایک بڑا نقصان ہوگا،لہٰذا ان غلطیوں کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم 'اسرار خودی' کے ان اشعار پر نظر ڈالتے ہیں تو علامہ کا موقف واضح ہوجاتا ہے۔ طوالت کے پیش نظر تمام اشعار یہاں درج کرنا میری نظر میں درست نہیں ہے۔لہٰذا نمونے کے طور پر اس حصے کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں افلاطون کے متعلق کہتے ہیں:

راہب اول فلاطون حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندے در لباس آدم است
حکم او بر جان صوفی محکم است
بس کہ از ذوق عمل محروم بود
جان او وارفتۂ معدوم بود
قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از لطف عمل محروم گشت

اور حافظ کے رنگ شاعری پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او
مے علاج ہول رستاخیز او
آں فقیہ ملت مے خوارگاں!
آں امام امت بے چارگاں
حافظ جادو بیاں شیرازی است
عرفیِ آتش بیاں شیرازی است
ایں سوئے ملک خودی مرکب جہاند
آں کنار آب رکن آباد ماند
محفل او در خورِ ابرار نیست
ساغر او قابل احرار نیست
بے نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

محولہ بالا اشعار اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ اقبالؔ نے نہ حافظ کی ذات پر تنقید کی ہے اور نہ ہی تصوف کو مسترد کیا ہے بلکہ وہ حافظ کے اس رنگ شاعری کے مخالف ہیں جو ادبیات اسلامیہ اور بہت حد تک تصوف پر اثر انداز ہو رہی تھی۔افلاطون کے فلسفے نے بھی اسلامی علم وادب اور مذہب پر اثر کیا نتیجتاً تصوف میں ''وحدت وجود'' یا'' توحید وجودی'' کا مسلک نکلا اور تمام

مضامین

www.urduacademyts.com

عالم طریقت پر چھا گیا۔ لیکن افلاطون کے تعلق سے کسی کو اعتراض نہ تھا۔ حافظ کی رنگ شاعری پر تنقید کے اعتراض کی وجہ غالباً حافظ سے لوگوں کی مذہبی عقیدت تھی۔ چونکہ ان اشعار کی شمولیت سے مثنوی لکھنے کا مقصد ہی فوت ہو رہا تھا اس لیے اقبالؔ نے اس متنازع فیہ حصے کو مصلحت کے تحت آئندہ طباعت میں حذف کر کے اس کی جگہ ''حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ'' کے نام سے نئے باب کو مثنوی میں شامل کر دیا۔ منقولہ بالا اشعار پر ردعمل اور اقبالؔ کی منشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

''ان اشعار پر ''زاہدان خشک'' بہت برہم ہوئے، اور کفر کے فتوے لگا دیے، اقبالؔ صلح پسند طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے رفع شر کے لیے'' اسرار خودی''میں سے یہ اشعار خارج کر دیے لیکن اصل میں ان اشعار سے نہ خواجہ حافظ کی ذات پر چوٹ ہے نہ سچے تصوف پر کوئی ضرب بلکہ بقول آقائے محیط طباطبائی ایرانی ۔''در آں مثنوی بر عرفاں ست و تصوف را کد خاموشے تاختہ بود۔''

عرض کیا جا چکا ہے کہ اقبالؔ کے ان خیالات سے لوگوں کے ذہن میں یہ مغالطہ پیدا ہوا کہ اقبالؔ کلیتاً تصوف کے منکر ہو گئے ہیں، ان میں اکبرؔ بھی ایک تھے۔ اس معاملے میں جہاں تک اکبرؔ کا تعلق ہے تو اکثر ناقدین و محققین کا خیال ہے کہ اکبرؔ علامہ اور 'اسرار خودی' کو لے کر غلط فہمی کے شکار تھے۔ اس سے مراد اکبرؔ کے علمی مرتبے پر سوالیہ نشان لگانا ہرگز نہیں ہے ان کا علمی مرتبہ مسلّم لیکن اس سے قطع نظر پورے معاملے پر جب ہماری نظر جاتی ہے تو واقعی لگتا ہے کہ اکبرؔ غلط فہمی کے شکار تھے اور اقبالؔ کے 'اسرار خودی' میں بیان کردہ افکار کو قابل اعتنا قرار نہیں دیا۔ اکبرؔ کے خطوط سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں نہیں جانتا کہ وہ کون سا اسلامی مقہور تصوف ہے جو انسان کو دنیا میں سعی سے روکتا ہے، بہر حال پڑھے لکھوں کا یہ پرانا شغل زندگی ہے۔ انسان کو ضرور مردانگی سے کام لینا چاہیے، لیکن کالج کی پروفیسری عرب کی مردانگی نہیں ہے جس کا وعظ کہا جاتا ہے۔''

عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبالؔ تصوف کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہیں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''اقبالؔ صاحب کو آج کل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے۔ کہتے ہیں کہ عجمی فلاسفی نے عالم کو خدا قرار دے رکھا ہے۔ اور یہ بات غلط ہے۔''

مزید ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''اقبالؔ نے جب سے حافظ شیرازی کو علانیہ برا کہا ہے میری نظر میں کھٹک رہے ہیں ان کی مثنوی 'اسرار خودی' آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب 'رموز بے خودی' شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہیں دیکھی جی نہیں چاہا''

اکبرؔ کی یہ بے اعتنائی اور طنزیہ جملے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اکبرؔ کے ذہن میں اقبالؔ کا تصور واضح نہ تھا اس لیے اقبالؔ نے انھیں لکھا کہ:

''میں نے خواجہ حافظ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے مے کشی بڑھ گئی ہے۔ میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک لٹریری

www.urduacademyts.com

نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے۔اپنے وقت پر اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا۔اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر بھی ہے۔خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا نہ ان کی شخصیت سے۔نہ اشعار میں مے سے مراد وہ مے ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں بلکہ اس مے سے مراد وہ حالت سکر ہے جو حافظ کے کلام سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔چونکہ حافظ ولی اور عارف تصور کیے گیے ہیں اس واسطے ان کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل نظرانداز کر دی ہے اور میرے ریمارک تصوف اور ولایت پر حملہ کرنے کے مترادف سمجھے گئے ہیں''۔

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

''معاف کیجئے گا آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا کہ (ممکن ہے غلطی پر ہوں) آپ نے مثنوی اسرار خودی میں صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظ کے متعلق لکھے گئے ہیں باقی اشعار پر شاید نظر نہیں فرمائی۔کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی کہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔

عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن تو پیدا ہوتا ہے لیکن ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔اس کے برعکس اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے۔اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔میرا تو عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔قنوطی لٹریچر کبھی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکا۔قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے'۔اس پر بھی اکبر نہیں مانے تو اقبال نے ایک اور خط ان کو لکھا جس میں کہتے ہیں:

''مخدومی آپ مجھے تناقص کا ملزم گردانتے ہیں یہ بات درست نہیں ہے۔مگر میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا۔میں نے گذشتہ خط میں بھی عرض کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لیے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجیے۔اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا۔''اقبال کو اکبر کے اس رویے سے تکلیف بھی تھی لہٰذا انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا:

''زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ مجھ پر عنایت فرمایئے ،عنایت کیا رحم کیجیے اور اسرار خودی کو ایک دفعہ اول سے آخر تک پڑھ جایئے۔جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اس کی تکلیف سے اس نے آہ و فریاد کی اسی طرح آپ کا اعتراض مجھ کو تکلیف دیتا ہے۔''

بالآخر اکبر کے رویے میں کچھ نرمی آئی تو انھوں نے علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان اختلاف کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی۔اس سلسلے میں خواجہ صاحب کو ایک خط میں حسب ذیل اشعار لکھتے ہیں:

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد
قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں
ہیں دشمن فتنۂ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لیے جنوں ہے تم کو اگر
دیووں کے لیے بنے سلیماں وہ بھی

اکبر اسرار خودی میں حافظ پر اعتراض کرنے کی وجہ سے اقبال سے برہم ضرور تھے لیکن انھوں نے خود حافظ کے اس رنگ پر طنز کیا ہے۔ان کی نظم 'برق کلیسا' کا یہ شعر میری سمجھ میں بالواسطہ طور پر ایک طرح کا طنز ہی ہے:

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

www.urduacademyts.com

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل رباعی میں اکبرؔ نام نہاد خانقاہوں اوران کے نظام اور مسلمانوں کی بے دینی ومعاشی ابتری کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تحریک ضرورت معیشت ہے بہت
خرقے کو بھی اب خیال خلعت ہے بہت
خالق کے جمال کا تو سودا کم ہے
اللہ کے نام کی تجارت ہے بہت

اقبالؔ نے اسے یوں بیان کیا ہے:

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن،تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ،وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے
کیا نہ بیچوگے جو مل جائیں صنم پتھر کے

مختصر یہ کہ ان موضوعات پر قلم اٹھانا کسی جرأت سے کم نہیں۔میں نے اپنی بساط بھر پوری کوشش کی ہے۔موضوع کے ساتھ میں نے کتنا انصاف کیا ہے اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔قطع کلام کے طور پر صرف اتنا کہنا ہے کہ:

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی واہ کا

☆☆☆

ڈاکٹر محمد افضل
صدر،شعبۂ اردو
گورنمنٹ پی۔جی۔کالج،باندا(یوپی)
موبائل۔9696962678

رمضان المبارک کی رحمتیں برکتیں اوراحکام

☆ ارشاد باری تعالیٰ ہے اے ایمان والو تم پر رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے کہ تم سے پہلے والی امتوں پر فرض تھے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا اور جس میں لوگوں کی رہنمائی کے لئے واضح نشانیاں ہیں اور یہ جھوٹ کو سچ سے الگ کرنے والا ہے اور جو کوئی بھی اس مہینے کو پائے اس پر اس مہینے کے روزے فرض ہیں لیکن اگر کوئی بیمار یا سفر میں ہے تو رمضان کے بعد چھوٹے ہوے روزے رکھ کر اپنے روزوں کا شمار پورا کرسکتا ہے۔

☆ رمضان وہ خوبصورت مہینہ ہے جس میں قرآن پاک نازل کیا گیا اسی لئے اللہ تعالی نے اس مہینے کو گناہوں سے آزادی اور بابرکت بنادیا ہے۔

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رمضان کے دوران مخلص ایمان اور اللہ سے اجر حاصل کرنے کی امید سے روزے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہوں کو معاف کردیا جائے گا.(امام بخاری)

☆ حضرت ابوامامہ نے بیان کیا:''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: مجھے کوئی ایسا عمل کرنے کا حکم دیں کہ مجھے جنت میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے. آپؐ نے کہا: روزہ رکھنا، کیونکہ کوئی اور عمل اس کے برابر نہیں ہے' پھر میں دوبارہ آپؐ کے پاس آیا اور یہی سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ رکھو .''] امام احمد، امام نساء اور امام حاکم[

☆ رمضان صرف بھوکا رہنے کا نام نہیں۔اس میں انسان اپنی عبادت کے ذریعے اپنے روپ کو منور کرسکتا ہے

☆ رمضان اللہ کی طرف سے دعاؤں مغفرت اور رحمتوں کا مہینہ ہے-آیئے اس مغفرت اور رحمتوں والے مہینے میں اپنے اللہ کو توبہ اور دعاؤں سے منالیں۔

☆ رمضان کے مہینے میں رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور یہ بہت ہی بابرکت مہینہ ہے

☆ یہ مہینہ صرف بھوکا رہنا نہیں بلکہ صبر بھائی چارہ اور درگزر کرنا سکھاتا ہے۔

☆ رمضان کے مہینے میں شیطان باندھ دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں

اللہ سبحانہ وتعالی ہم سب کو رمضان کی تمام سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے۔آمین

oOo

www.urduacademyts.com

سراؔج اورنگ آبادی کی غزلیہ شاعری: ایک جائزہ

(کلیات سراج: مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی روشنی میں)

دکن میں اردو شاعری کی روایت بہت قدیم رہی ہے۔اسی قدیم روایت میں فارسی طرز شاعری کو شامل کر کے ولؔی نے اسے نئی صورت عطا کی۔ ولؔی کی اس نئی طرز ادا یا نئی روایت کو دکن میں وراثت کے طور پر برقرار رکھنے والے شعرا میں سراج اورنگ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ ولؔی اور سراج ہی وہ شعرا ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ دکن اور شمالی ہند کی شعری روایت کو ملا کر ایک کر دیا تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں سراؔج اورنگ آبادی کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری کی تنقیدی رایوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

''کلیاتِ سراج'' کی پہلی اشاعت ۱۹۴۰ء میں پروفیسر عبد القادر سروری کے طویل مقدمہ کے ساتھ ہوئی۔اس کا متن مختلف نسخوں سے تقابل اور تصحیح کے بعد تیار کیا گیا ہے،جس میں بنیادی حیثیت عبدالرسول خاں کے مرتبہ نسخہ (۱۱۵۲ھ) کو حاصل رہی ہے۔ یہ نسخہ دراصل سراج کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور سراؔج کے مطالعہ میں رہ چکا تھا۔[1] جو تحقیق کی رو سے مصنف کی نظر سے گزرے ہونے کی بنیاد پر زیادہ مستند ہوا۔ ''کلیاتِ سراج'' (مرتبہ عبدالقادر سروری) میں ۱۱ مثنویات، ۵۰۸ غزلیات، ۳۰ فردیات، ۹ رباعیات، ۱۰ قصیدہ، ۵ مستزاد، ۱۱ مخمسات، ۱۰ ترجیع بند اور ۴ مناجات شامل ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سراؔج نے ہر شعری صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

عبدالقادر سروری نے مقدمہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سراؔج اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور مختلف تذکروں میں ان کے ذکر کا جائزہ پیش کیا ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں سراؔج اورنگ آبادی کی شاعری اور ان کی انفرادی خصوصیات پر گفتگو کی ہے۔

سراؔج اور ان کی شاعری پر سب سے پہلے جس تذکرہ نگار نے توجہ دی وہ میر تقی میرؔ ہیں۔لیکن میرؔ نے بھی ''نکات الشعرا'' میں سراؔج سے متعلق چند سطریں ہی لکھی ہیں اور منتخب کلام کے طور پر ان کے تیرہ اشعار پیش کیے ہیں۔ میر تقی میرؔ کے بعد مختلف تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں سراج کو جگہ دی ہے،لیکن ان سے سراؔج کی زندگی کی مکمل معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ مگر ان میں ایک تذکرہ ایسا بھی ہے،جس کا مصنف (افضل بیگ خاں قاقشال) نہ صرف سراؔج کا ہم وطن ہے بلکہ ان کا ہم عصر بھی ہے،جس نے اپنے تذکرہ ''تحفۃ الشعرا'' میں سراؔج کی جتنی تفصیلات جمع کر دی ہیں وہ کسی دوسرے تذکروں میں نہیں ملتیں۔اس سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''سب سے پہلا تذکرہ جس میں سراج کے

www.urduacademyts.com

حالات صحت کے ساتھ اور کسی قدر تفصیل سے ملتے ہیں وہ ''تحفۃ الشعرا'' ہے۔''

انہیں تذکروں میں درج معلومات کو تحقیق کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کے بعد سروری صاحب نے سراؔج کی مکمل حالات زندگی ترتیب دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ عبدالقادر سروری نے سراؔج اورنگ آبادی کی شاعری کے آغاز اور عروج کا زمانہ ۱۱۴۶ھ یا ۱۱۴۷ھ خیال کیا ہے اور ۱۱۵۱ھ یا ۱۱۵۲ھ اور ۱۱۶۹ھ کے درمیانی عرصے کو ان کے شاعری ترک کر دینے کا زمانہ تسلیم کیا ہے۔ ان پانچ یا پچیس سال کے مختصر سے عرصہ کو اور سراؔج کے شعری سرمایہ کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سراؔج نے اپنے فطری رجحان کے تحت شاعری شروع کی اور جب شعر گوئی انہیں اپنے مرتبے سے کم تر چیز لگنے لگی تو انہوں نے شاعری ترک کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ:

''رفتہ رفتہ ان کی شاعری کی شہرت زیادہ تر علما اور شعرا کے حلقوں تک محدود ہوتی گئی، اور وہ اپنی روحانی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ شہرت حاصل کرتے گئے۔''

سراؔج نے فنِ شاعری میں اگر کسی شاعر سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے تو وہ ولؔی دکنی ہیں۔ عبدالقادر سروری کے نزدیک سراؔج نے اپنی شاعری میں نہ صرف ولؔی کی روایت کو برقرار رکھا ہے بلکہ اس کی نشو ونما میں بھی اہم کردار ادا کیے ہیں۔ وہ ولؔی کی شاعری کی صورت سے زیادہ معنی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ولؔی اور سراؔج کی شاعری میں زبان، اسلوب، بے ساختگی اور سلاست کی بعض خصوصیات مشترک ہونے کے باجود دونوں کے رنگ تغزل جداگانہ ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''ولؔی کے پاس جو چیز رعب، علمیت اور ہمہ گیر ذکاوت کی شان میں ظاہر ہوتی ہے، وہی چیز سراؔج کے پاس درد اور سوز و گداز کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔''

میؔر اور سراؔج کے کلام میں درد اور سوز و گداز کی نمایاں خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے سروری صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس طرح میؔر ''یاس'' کے مضامین کے بادشاہ ہیں اسی طرح سراؔج کے یہاں ''احساس، قناعت، تسلیم ورضا، سپردگی اور درد میں لذت کی چاشنی موجود ہے۔'' اردو کے یہی دو ایسے شاعر ہیں جن کے نہ صرف فکر و خیال ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں بلکہ بعض دفع تو الفاظ اور اسالیب بھی ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''سراؔج اور میؔر کے پاس بعض خاص خاص مضامین ایک طرح پر بندھے ہیں اور کہیں کہیں تو نہ صرف مصرعے، بلکہ اشعار بھی ایک ہوگئے ہیں۔''

مثال کے طور پر سروری صاحب نے میؔر اور سراؔج کی کئی غزلیں اور متفرق اشعار پیش کیے ہیں۔ ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیں: ؎

عشق نے خوں کیا ہے دل جس کا
پارہ لعل اشک ہے تس کا
(سراؔج)

www.urduacademyts.com

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
(میرؔ)

جس پھول نے ترے سیں کیا دعویٰ جمال
وہ پائمال آفتِ بادِ خزاں ہوا
(سراؔج)

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا
جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
(میرؔ)

ہم فقیروں پہ ستم، جیتے رہو
خوب کرتے ہو بجا کرتے ہو تم
(سراؔج)

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
(میرؔ)

ایسے بہت سے اشعار سراؔج اور میرؔ کے یہاں مل جاتے ہیں، جن میں خیال اور اسلوبِ بیان قدرے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔

سراؔج اورنگ آبادی کی شاعری کا دوسرا نمایاں عنصر سروری صاحب کے نزدیک ''بے ساختگی اور ادائے مطلب میں بے حد سادگی ہے۔'' یہاں بھی وہ میرؔ اور سراؔج کے کلام میں موجود سادگی کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ میرؔ کو اپنی شاعری کے معیار کو درست کرنے کے لیے اچھا خاصہ وقت ملا تھا، اس لیے ان کا طرز ایک حد تک جدید ہوگیا۔ نیز سراؔج کا طرز قدیم ہوتے ہوئے بھی زبان و اسلوب کی سادگی کی بنا پر لطیف ہوگیا ہے۔ اسی سادگی اور لطافت کا نتیجہ ہے کہ سراؔج کی غزلیں آج بھی خاص محفلوں میں پسند کی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ان کی زندگی میں اور آج تک بھی صوفیوں کی مجلسوں میں اور سرود و سماع کی محفلوں میں گائی جاتی ہیں۔''

اردو غزل میں تصوف کے مضامین ابتدا سے ہی پیش ہوتے رہے ہیں، بلکہ ایک زمانے میں تو یہ کہا جاتا تھا کہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است''، یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایسے شعرا کے یہاں بھی مسائل تصوف کے بیان مل جاتے ہیں جن کا حقیقی زندگی میں تصوف سے کوئی واسطہ نظر نہیں آتا۔ ان شعرا کے مقابلے سراؔج تو باضابطہ صوفی انسان تھے، تو ان کے یہاں تصوف کے موضوعات کا پایا جانا فطری بات ہے۔ بلکہ عبدالقادر سروری کا خیال ہے کہ متصوفانہ رجحان کی کارفرمائی ولؔی کے کلام سے زیادہ سراؔج کے یہاں موجود ہے۔ ان کی صوفیانہ شاعری اپنا ایک الگ رنگ رکھتی ہے۔ کیوں کہ سراج نے ان کو اپنی شاعری میں برائے شعر گفتن نہیں بلکہ زندگی کی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس بابت وہ لکھتے ہیں:

''سراؔج کا تصوف، بند خانقاہ صوفی اور طالب جنت زاہد سے بالکل جدا ہے جس میں نفسانیت، خوف یا نفع اور نقصان کے کاروباری احساس کو دخل ہوتا ہے۔ ان کا تصوف صاحب دل کا تصوف ہے جس میں مطلوب حقیقی

www.urduacademyts.com

حسنِ مجسم ہے۔''

سراؔج کے یہاں فلسفیانہ مضامین کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے عبدالقادر سروری نے غالبؔ اور سراؔج کا موازنہ پیش کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ سراؔج کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جن پر غالبؔ کے طرز فکر کا گمان ہوتا ہے۔چوں کہ غالبؔ کا زمانہ سراؔج کے بعد کا ہے لہٰذا ممکن ہے کہ سراؔج کا کلام غالبؔ کی نظر سے گزرا ہوگا۔کیوں کہ غالبؔ اور سراؔج کے یہاں بہت سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں فکر یا خیال کے اعتبار سے بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔اس تعلق سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

ہمیشہ دور عالم مختلف ہے
کہ ہے گردش میں ہر دم نیلگوں طاس
(سراؔج)

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
(غالبؔ)

آبِ رواں ہے صاحب عمر شتاب رو
دہر فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا
(سراؔج)

رو میں رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
(غالبؔ)

سراؔج کی زندگی جس طرح مختلف حالات سے دو چار رہی ہے،ویسی شاید ہی اردو کے کسی دوسرے شاعر کے حصے میں آئی ہو۔یہی وجہ ہے کہ سراج کو زندگی کے بیشتر مسائل پر غور وفکر کرنے کا موقع ملا اور اسی غور وفکر نے ان کے خیالات میں گہرائی اور اسلوب میں ندرت پیدا کر دی ہے۔اسی لیے بقول عبدالقادر سروری ''سراؔج کی شاعری اردو غزل کے بہترین شعرا کے مد مقابل ہے۔'' مثال کے طور پر سراؔج کے فلسفیانہ رنگ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:۔

عالم آب ہے صحرائی گلزارِ جنوں
خطِ ساغر رگِ برگِ گلِ سودا سمجھوں

ooo

چشمِ عبرت سے تماشائے جہاں کرتا ہوں
خاک در خاک ہے بہ انجمن گل در گل

ooo

خیال نرگسِ ساقی سیں دل ہے لرزش میں
ہوا ہے رعشہ فزا کثرت مدام شراب

سراؔج کے کلام میں تصوف اور فلسفہ کے ساتھ ساتھ عشق ومحبت کے موضوعات بھی بہ کثرت دیکھے جا سکتے ہیں۔عبدالقادر سروری کا خیال ہے کہ عقل اور دل کی کشمکش

www.urduacademyts.com

جس طرح ہمیں اقبالؔ کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ ہمیشہ عقل پر دل کو ترجیح دیتے ہیں ۔یہی صورت حال سراجؔ کے یہاں بھی موجود ہے، وہ اکثر عقل اور دل کی کشمکش میں محبت کے مقابل عقل کو ادنیٰ چیز بتاتے ہیں: ؎

اگر خواہش ہے تجھ کوں اے سراجؔ آزاد ہونے کی
کمند عقل کو اپنے گلے کا ہار مت کیجو

ولیؔ کی طرح سراجؔ کے نزدیک بھی عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے، کیوں کہ یہی محبت ''دل و دماغ کی تربیت کر کے حقیقی محبت کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔'' اس لیے وہ کہتے ہیں: ؎

گر حقیقت کی سیر ہے خواہش
راہِ عشق مجاز لازم ہے

ooo

ہرگز نہیں ہے اس کوں حقیقت کی چاشنی
جس نے مزہ چکھا نہیں عشق مجاز کا

سراجؔ کے عشقیہ اشعار کے امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سروری صاحب کہتے ہیں کہ ان کا عشق غیر فطری آہ و نالہ، مبالغہ آمیز جذبات و بناوٹی محبت سے پاک ہے، وہ ان کے زندگی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''سراجؔ کی عاشقانہ شاعری کے دو پہلو ہر جگہ نمایاں ہیں ۔ایک تو اس دنیائے رنگ و بو کی حسین چیزوں کی قدر دانی جس میں ان کے کلام کا وہ سارا حصہ ان کے ذاتی عنصر کے ساتھ آجاتا ہے۔''

سراجؔ اورنگ آبادی کی لفظیات اور اسالیب کے متعلق عبدالقادر سروری خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اردو میں کم ایسے شعرا ہوں گے جن کے الفاظ و اسالیب کا خزانہ اتنا وسیع ہوگا۔ جس طرح ولیؔ نے اپنے محبوب کو مختلف ناموں سے پکارا ہے سراجؔ بھی اپنے معشوق کو اسی طرح الگ الگ ناموں سے مخاطب کیا ہے۔ مثلاً جاناں، سجن، من برن، موہن، پیو، شوخ، صنم، یار، چاند، دوست، جانی، گلبدن ،وغیرہ وغیرہ۔ سراجؔ نے اپنے کلام کو خوش رنگ بنانے کے لیے کچھ ترکیبیں بھی وضع کی ہیں۔ مثلاً کان حسن، دریائے حسن، گلِ گلشن خوبی، بہارِ مراد، جانِ سراج، جانِ نظر، مقصدِ سراج، لالہ گلزارِ جاں، جانِ چشمِ انتظار وغیرہ یہ وہ تراکیب ہیں جو سراجؔ سے پہلے شاید ہی کسی شاعر کے یہاں ملیں۔

تلمیحات کے حوالے سے بھی سراجؔ کی فکر میں وسعت نظر آتی ہے۔ یہاں وہ خود کو مروج تلمیحات تک محدود نہیں رکھتے ، بلکہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کے ساتھ ہندی تلمیحات کا بھی بے تکلف استعمال کرتے ہیں، جن کی نشان دہی کرتے ہوئے عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں:

''فارسی اور عربی تلمیحات کے علاوہ ان کے کلام میں، ہیر رانجھا، چندر بدن ومہیار، بھیم، ارجن، رام، لچھمن، بید وغیرہ جیسی ہندوستانی تلمیحوں کی بھی کافی تعداد موجود ہے۔''

اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں: ؎

مشتاق ہوں میں تیری فصاحت کا ولیکن
رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز

www.urduacademyts.com

روحِ چندر بدن اے بوالہوس آزردہ نہ کر
خوب نہیں تربتِ مہیار کی سوگند نہ کھا

ooo

نین راون ہیں، ارجن بال، پلکیں بھنوں دھنک وہم کی
ہمارے دل کی دکھ نگری کے راجا رام چندر ہو

سراؔج کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی حسین صورت پر فریفتہ ہونے سے زیادہ اپنے دل کی بے چینی کی تحریک پر شعر کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تخاطب بیرونی دنیا کے بجائے اندرونی دنیا سے زیادہ ہوتا ہے، جس میں دل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی خصوصیات کی بنیاد پر عبدالقادر سروری، سراؔج اورنگ آبادی کو اردو غزل کا استاد تسلیم کرتے ہیں اور غزل کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں کمال حاصل کرنے کے اعتبار سے میرتقی میرؔ کے بعد سراؔج اورنگ آبادی کا درجہ متعین کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس سے متعلق لکھتے ہیں:

''سراؔج اور میرؔ ہی ایسے سخن سنج ہیں جنہیں داخلی اور غنائی شاعری یعنی غزل اور بیانیہ شاعری اور مرقع نگاری دونوں میں دستگاہ تھی۔ سراؔج غزل کے بلاشبہ استاد ہیں لیکن مثنوی میں بھی ان کی جگہ صف اوّل میں ہے۔''

عبدالقادر سروری نے سراؔج کی شاعری بطور خاص غزل گوئی کا جن جن حوالوں سے جائزہ لیا ہے اور اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں وہ قابلِ احترام ہیں۔ سروری صاحب کے اس مبسوط مقدمہ سے پہلے سراؔج سے متعلق مشکل سے ایک یا دو تحقیقی/تنقیدی مقالے لکھے گئے تھے۔ اس کے باوجود سروری صاحب نے ''کلیاتِ سراج'' کی ترتیب کا ذمہ اپنے سر لیا اور سراج کے کلام کا صحت مند متن تیار کرتے ہوئے ان کی حالاتِ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی اور ان کے کلام پر مفصل گفتگو کی، جو سراؔج اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر خیرالدین اعظم
لکچرر، گورنمنٹ انٹر کالج، اترپردیش
رابطہ نمبر: 9045721557 (+91)

ذیابطیس کے مریض حسب ذیل پھل
درج ذیل حساب سے کھا سکتے ہیں

خربوزہ: اس پھل کے بھی چند ٹکڑے کھانا ہی مفید ہوگا کیونکہ پورا خربوزہ 8.7 گرام شوگر رکھتا ہے جو مریضوں کے لئے نامناسب مقدار ہے۔

کیوی: ایک کیوی گو کہ یہ ترش اور لیمونی پھل ہے اور ذائقہ دار بھی ہے۔ اس سے آپ کو صرف 6 گرام شکر ملے گی۔

آواکادو: اگر آپ اس پھل کو پسند کرتے ہیں تو ایک چھوٹے سائز کا پھل کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں 1.3 گرام شکر موجود ہے جو خطرہ نہیں بنتی۔

تربوز: یہ پھل آپ ایک چائے کی پیالی کی مقدار میں کھا سکتے ہیں۔

اسٹرابیریز: 6 یا 7 اسٹرابیریز لے کر کھائی جا سکتی ہیں۔

انار: پورے ایک درمیانے حجم کے انار میں 10.1 گرام شکر موجود ہے جو مریضوں کے لئے مناسب مقدار نہیں لہٰذا آپ تین سے چار چائے کے چمچ کے برابر انار دانے کھا سکتے ہیں۔

بلیک بیریز: یہ بھی ایک پیالی کے برابر لی جائیں تو 7 گرام تک شوگر جسم میں جاتی ہے۔

پپیتا: نظام ہاضمہ درست رکھنے کے لئے پپیتے جیسا پھل بے حد معاون ہوتا ہے آپ ہفتے میں دو ایک بار 1/2 کپ کے برابر پپیتا کھا سکتے ہیں۔ اس پھل میں 6.1 گرام شکر ہے۔

(بہتر ہے کہ پھل استعمال کرنے سے قبل اپنے معالج سے مشورہ کر لیں)

ماخوذ از اردو پوائنٹ' تاریخ اشاعت 21-12-2021

مضامین

سرسید کے تعلیمی تصور میں تعلیم نسواں کے عنصر

اقوام کی تاریخ میں سرسید احمد خان انیسوی صدی کے وہ بالغ نظر اور مآل اندیش مرد قلندر ہیں جن کی شخصیت تقریباً دو صدی گزر جانے کے بعد بھی اپنی معنویت اور افادیت میں کلیدی شاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔سرسید کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے یہاں کس قدر اعتدال، سلجھاؤ، ژرف نگاہی اور دور بینی ملتی ہے اور بعض مسائل کے متعلق ان کی رائے اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ صایب اور قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے۔

ہندوستان کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد اہل ہند خصوصاً مسلمانان ہند کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی۔ جسے دیکھ سرسید مضطرب ہوا ٹھے اور انھوں نے گرد پیش کا جائزہ لیا۔دگر گوں سیاسی حالات اور تہذیبی و اقتصادی انحطاط بالخصوص مسلمانان ہند کی نا گفتہ بہ صورت حال کا معروضی مطالعہ کر کے قوم و ملت کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھایا۔انھوں نے مسلمانوں کو خواب و خیال کی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا کی طرف، ذاتی فلاح سے قومی بہبود کی طرف، اندھی و فرسودہ رسم ورواج کی گرفت سے نکال کر حیرت فکر اور عقلیت کی طرف اور قدیم اسالیب فکر سے جدید عالمی معیاروں کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے لوگوں کو صرف خواب ہی نہیں دکھائے بلکہ اسے حقیقت بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔اسی خواب کو حقیقت بنانے کی خاطر انگلستان کا دورہ کیا تقریباً ایک سال پانچ مہینے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آئے۔

انگلستان میں انھوں نے تعلیمی اداروں اور ان کے نظم نسق کا عمیق مشاہدہ کیا، شرفاء اور ماہرین علوم وفنون کی محفلوں سے روبرو ہوئے۔مغربی عورت کی شائستگی ان کے تعلیمی رجحانات کے علاوہ طریقۂ زندگی سے کافی حد تک متاثر ہوئے۔ان کو نہایت تاسف ہوا کہ ہماری ہندوستانی عورت کے متعلق مغربی عورت کے قلوب و اذہان میں کیسے ادنیٰ و فرسودہ خیالات ہیں۔اپنے سفرنامہ ''مسافران لندن'' میں صفحہ نمبر ۱۰۹ پر سرسید فرماتے ہیں کہ :

''جب یہاں عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا نہیں جانتیں اور صلہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل عاری ہیں تو ان کو بڑا تعجب ہوتا تھا۔'' [1]

دوسری جانب سرسید کے متعلق لوگوں کی ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ ان کی ساری تعلیمی سعی صرف لڑکوں کی خاطر تھی لڑکیوں کے لئے نہ تھی۔شیخ عبداللہ، گیل مینو اور ڈیوڈ لیلی ویلڈ وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید نے مسلم عورتوں کو ان کی تقدیر پر چھوڑ دیا تھا اور ان کی فلاح و بہبود کا کوئی نقشہ مرتب نہیں کیا۔تعلیم نسواں سے متعلق سرسید کے تصورات پر بحث کرتے ہوئے شیخ عبداللہ رقم طراز ہیں :

''یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ سرسید لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدارس کے جاری کرنے یا کسی

جداگانہ انتظام کے مخالف تھے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑکیاں مدارس میں پڑھ کر لڑکوں کی طرح آزاد ہو جائیں۔ سرسید کے پاس اس اصولی امر کی تائید کے لئے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں تھی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اور زندگی کے عام حالات سے ذاتی واقفیت کی بناء اس معاملے میں سرسید کی رائے مجھے نہ مصلحانہ معلوم ہوئی اور نہ مدبرانہ۔ میری اپنی رائے یہ قائم ہوئی تھی اور ہے کہ سرسید کے دل پر اس معاملے میں رسم و رواج کا بہت گہرا اور خاص اثر تھا۔ وہ خاص اس معاملے میں رسم و رواج کے دل دادہ تھے۔ وہ پردے کے معاملے میں سخت قدامت پرست لوگوں کے خیالات کے حامی تھے اور ان کو یہی زیادہ اندیشہ تھا کہ تعلیم پا کر لڑکیاں پردہ چھوڑ کر نکل آئیں گی۔'' ۲

مندرجہ بالا عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید کا مزاج مشرقی اور انداز مغربی تھا۔ گیل مینو کے مطابق سرسید مسلم عورتوں کو مذہب کی جانب دیئے جانے والے حقوق کے بارے میں آگہی پیدا کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ گیل نے اپنی کتاب ''Secluded Scholars'' میں اس ضمن میں لکھا ہے :

''۱۸۹۰ء کی دہائی میں سید ممتاز علی علی گڑھ آئے اور سرسید احمد خان کو اپنی کتاب کا مسودہ جو کہ اسلامی قوانین میں خواتین کے حقوق پر تھا، پیش کیا۔ سرسید نے مسودے کو پڑھنا شروع کیا، تو ان کو شدید صدمہ پہنچا، سرسید نے جب دوسری بار مسودے کو پڑھا تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور تیسری قرات کے دوران ان کے ہاتھ کپکپانے لگے اور آخیر میں انھوں نے اس مسودہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔ اسی وقت سرسید کا ملازم ان کو دوپہر کے طعام کے لئے بلانے آ گیا' سرسید کھانے پر چلے گئے۔ موقع غنیمت جان کر ممتاز علی نے ردی کی ٹوکری سے اپنے مسودے کے پھٹے ہوئے ٹکڑے جمع کیے اور سرسید کے انتقال کے بعد یہ مسودہ ''حقوق نسواں'' کے عنوان سے شائع کیا۔''

ڈیوڈ لیلی ویلڈ کے مطابق عورتوں کے حقوق کی مسلسل مانگ نے سرسید کو برافروختہ کر دیا۔ آگے لکھتے ہیں :

''پردے کی سخت وکالت کرنے والے اور خواتین کی تعلیم کے مخالف سرسید، کسی بھی طرح سے جدید خیالات والے انسان نہ تھے جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں۔'' ۳

ایسے تخیلات کے لوگ اپنے محدود مطالعہ اور تعصب و تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہیں۔ تعلیم نسواں سے متعلق سرسید کے تصورات و نظریات کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اس دور کے معاشرتی نظام اور مسلمانوں کے مزاج و تخیلات کی واقفیت بے حد ضروری ہے۔ مردوں میں انگریزی تعلیم سے رغبت کا فقدان تھا اور عورتوں میں تو بالکل تھا ہی نہیں۔ ایسے پُر اسرار حالات میں لڑکیوں میں جدید تعلیم کی تحریک سرسید کا دانش مندانہ قدم مثبت نہ ہوتا، بلکہ قوم میں تفریق ڈالنے کے مترادف خیال کیا جاتا۔ انہیں وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ پہلے مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ جب ان کے اندر تعلیم کی روشنی پھیلے گی اور وہ علم کی

اہمیت سے روشناس ہوجائیں گے تو خود بخود عورتوں کی تعلیم کی طرف راغب ہوں گے۔اپنے ان تصورات کی وضاحت انھوں نے پنجاب کے سفر کے دوران خواتین کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کی کہ :

''اے میری بہنو!تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جس میں مردوں کے حالات درست ہونے سے پہلے عورتوں کے حالات میں درستی ہوگئی ہو۔تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔''

اس نظریے کی تائید میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں :

''اس وقت ہم عام یورپ کی تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں تو عورتیں بھی لائق ہوجاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں،عورتیں بھی لائق نہیں ہوسکتیں،یہی سبب ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم کا خیال کرتے ہیں۔اس کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔''

مسلمانوں کے فرسودہ خیالات نے ان میں بہت سی دینی اور معاشرتی خرابیاں پیدا کر دی تھیں۔جس کے باعث عورتیں اسلام کی عطا کردہ سیاسی، اقتصادی و معاشرتی حقوق سے محروم تھیں مغرب والوں نے عورتوں کو انیسویں صدی میں جدو جہد کے ذریعہ حقوق عطا کیے تھے جب کہ اس سے بہت پہلے مذہب اسلام نے ساتویں صدی میں ہی عورتوں کے حقوق دے دیے تھے۔بس ہمیں اس پر عمل درکار ہے۔

سرسید کے خیال میں مسلمانوں کی پستی،عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کی وجہ سے ہے۔قوم کی ترقی میں عورتوں کا اہم رول ہوتا ہے۔قوم کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ صحت مند تربیت بھی درکار ہوتی ہے جو عموماً عورتوں سے ہی ممکن ہے۔ بڑے تاسف کی بات ہے کہ ہماری قوم میں خواتین کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔سرسید کے نظریے کے مطابق عورت ہی ایسی ہستی ہے جو سماج کو خواب سے بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کرتی ہے۔ایک بار خاتون پنجاب کے ایڈ ریس کے جواب میں سرسید نے ان الفاظ میں عورتوں کی عزت افزائی کچھ اس طرح سے کی :

''اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت قدر کرتا ہوں۔ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے۔مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔''

سر سید احمد خان عورتوں کے پردے کے بھی علم بردار اور نقیب تھے۔اس کے باوجود عورتوں کی تعلیم و تعلم کے آرزو مند تھے۔اس حقیقت سے پوری طرح بے پروا ہوئے بغیر کہ انھوں نے خواتین کی تعلیم کے لئے کوئی جوش و خروش نہیں دکھایا' سرسید کو عورتوں کی نئی تعلیم کے سسٹم پر

اعتراض تھا۔ وہ عورتوں کے قدیم تعلیمی سسٹم کے حامی تھے اور قدیم طرز کی تعلیم کو عورتوں کے لئے کارآمد سمجھتے تھے۔ سرسید لکھتے ہیں :

''اے میری بہنو! میں قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو۔ وہی طریقہ تمہارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔''

سرسید کے نزدیک تعلیم کبھی بھی آفاقی نہیں ہوسکتی کیوں کہ تعلیم کی جڑیں خاص جغرافیائی علاقوں میں مقیم اقوام کی تہذیبی اقدار اور جمالیاتی احساس سے جڑی ہوتی ہیں۔ جدید نصاب کا مکمل طور پر یورپ اور امریکہ میں رہنے والی خواتین کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے تاکہ وہ پارلیمنٹ کی ممبر، پوسٹ ماسٹر اور ٹیلی گرام ماسٹر بن سکیں لیکن یہ ہندوستان میں موجودہ زمانہ یا قریب مستقبل میں ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان میں وہ مضمون جو پہلے زمانے میں پڑھائے جاتے تھے آج بھی اہم ہیں۔ یہ مضمون دینیات اور اخلاقیات کے ہیں۔ سرسید کہتے ہیں :

''میں نہیں سمجھتا کہ عورتوں کو افریقہ اور امریکہ کا جغرافیہ دکھانے اور الجبرا اور مرہٹوں اور روہیلوں کی لڑائیوں کو پڑھانے سے کیا نتیجہ ہے۔''

سرسید ہر دل میں علم کی شمع روشن کرنا چاہتے تھے تاکہ قوم کی تمام ترقی کی منازل کو طے کیا جاسکے۔ مرد و زن کی معاونت سے ہی ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ دونوں کو خود کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانا ہوتا ہے۔ عورت کی حقیقی دنیا اس کا گھر ہوتا ہے' وہ اسے اپنے حسن تدبیر سے نمونۂ جنت بنادیتی ہے۔ یہ ذمہ داریاں اس کی مخصوص فطرت کی وجہ سے ہی اس پر عائد ہوتی ہیں۔ درحقیقت یہ ساری خوبیاں خواتین کے تعلیم یافتہ ہونے پر منحصر ہیں۔ جب تک خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہوں گی وہ بچوں کی تربیت اور معاشرے کی تشکیل میں تعاون کرنے سے قاصر رہیں گی۔ سرسید نے تعلیم نسواں اور حقوق نسواں دونوں پر خصوصی توجہ دی۔ ان کی نظر میں حکومت کی جانب سے لڑکیوں کو جدید سیکولر تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش بے معنی ہیں، ان کو کامل یقین تھا کہ عورتیں حقیقت میں جب ہی آزاد ہوسکیں گی جب تعلیم و تربیت کے دیسی ماڈل پر عمل درآمد فعال طریقے سے کیا جائے گا۔ سرسید کا سفرنامہ خواتین میں ایک مصری لڑکی کی تعریف کرتے ہوئے اس کی سیرت کو بیان کرتے ہیں:

''مصر کی ایک مسلمان لڑکی کا میں نے حال سنا کہ سوائے عربی زبان کے جو اس کی اصلی زبان ہے اور جس میں وہ نہایت فصاحت سے لکھتی پڑھتی ہے، فرنچ زبان بھی نہایت خوب بولتی ہے اور لیٹن اس قدر جانتی ہے کہ جو مضمون یا شعر

اس کے سامنے رکھا جائے اس کو پڑھ لیتی ہے اور مضمون سمجھ لیتی ہے۔اس کے بھائی نے فرانس میں تربیت پائی تھی، جب وہ اپنے گھر گیا تو اس کی بہن نے جس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور اپنے کنبہ کے بزرگوں سے اس نے اپنی زبان عربی میں بہت کچھ پڑھا تھا، اپنے بھائی سے فرنچ اور لیٹن سیکھی۔''

سرسید کی کتاب اسباب بغاوت ہند کی اہمیت اس پس منظر کے لئے خاص ضروری ہے۔ آج بھی نو آبادیاتی حکومت میں طرز حکمرانی کے مطالعہ سے متعلق سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔سرسید نے بغاوت کے اسباب شفافیت اور معروضیت کے ساتھ منصفانہ طریقے سے بیان کیے ہیں۔ان کے مطابق لڑکیوں کے علاحدہ اسکول یا مخلوط اسکول کھولنا اس بدامنی کی ایک اہم وجہ تھی۔سرسید رقم طراز ہیں:

''لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا اور سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہوجائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی، پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قائم کریں گے تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہوگی۔اس سبب سے وہ ہر طرح پر بطریق جائز ناجائز لوگوں کو واسطے قائم کرنے لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمائش کرتے ہیں اور اس سبب سے زیادہ تر لوگوں کے دلوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا ان کو یقین ہوتا جاتا ہے۔''

لندن کے سفر میں جہاز پر اتفاقاً انگریز مصلح میری کارپینٹر کی ملاقات سرسید سے ہوئی اور تعلیم نسواں پر تبادلہ خیال ہوا۔

''جب سے میں نے ان کا نام اور ان کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورت کے سنا تھا میں بہت مشتاق ان کی ملاقات کا تھا۔خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ ان کی ملاقات ہوگئی۔''

سرسید احمد خان کی یہ حکیمانہ بصیرت اور مآل اندیشی بالکل درست ثابت ہوئی۔مسلمانوں کی جانب سے عورتوں کے حقوق اور ان کی تعلیم سے متعلق مطالبات کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔لوگوں نے اعتراف کیا کہ عورتوں کی جہالت قوم کی ترقی میں مانع ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی قرارداد میں تعلیم نسواں سے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی:

''اس کانفرنس کی رائے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالتوں میں مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کی بھی کوشش لازمی ہے کیوں کہ قوم کی اصلی ترقی زیادہ تر اسی پر منحصر ہے۔ یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ عورتوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہو۔''

اس بات کو سوچنے پر دل و دماغ قاصر ہے کہ سرسید جیسا انسان تعلیم نسواں سے متعلق برطانوی حکومت کے وقت رائج تعلیم نظام کو اختیار کرنے پر زور دیتا ہے۔گھریلو تعلیم کے ماڈل کے سوا کوئی دوسرا نظریہ نا قابل قبول اور وہ آخر تک اسی ماڈل کی وکالت کرتے رہے۔اس سلسلے میں ڈیوڈ لیلی ویلڈ نے لکھا ہے:

مضامین

''ہم سب ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے اس مسئلے (تعلیم نسواں) میں قائدانہ کردار ادا نہیں کیا، اگر اس سلسلے میں وہ کچھ کرتے تب بھی چیزیں کچھ مختلف نہیں ہوتیں۔ یہ مسئلہ نجی ترجیح سے جڑا نہیں ہے۔ سرسید احمد نے اپنے وقت کے ہندوستان میں رائج مرد اساس کی ہم نوائی کی جو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں موجود تھا۔'' ۱۴

بعدازاں ۱۸۹۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس میں باقاعدہ ''شعبۂ نسواں'' قائم کیا گیا اور لوگوں کو سرسید کی اصلاحی مصلحت اور حقیقت بینی کا قائل ہونا پڑا۔ ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا پہلا مدرسہ بالائے قلعہ علی گڑھ کے ایک مکان میں استانی اختری بیگم (شیخ عبداللہ کی شریک حیات) کی نگرانی میں قائم ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں لڑکیوں کا یہ اسکول انٹرمیڈیٹ تک ہوگیا جو سرسید کے ایک شاگرد شیخ عبداللہ کی کاوشوں کا ثمرہ تھا۔

سرسید نے جدید تعلیم کو مسلمانان ہند کے لئے تمام پستی و تنزلی کے امراض کا نسخہ کیمیا قرار دیا۔ قوم کی ترقی و سربلندی کے متعلق اس کی تمام تر سعی و پیہم بارآور ثابت ہوئی۔ آج ہماری قوم میں تہذیب و شائستگی، ترقی یافتہ رجحانات، دینی اخوت اور روشن خیالی رفتہ رفتہ امتیازی حیثیت حاصل کرتی جارہی ہے۔

حواشی:

۱۔ سفرنامہ مسافران لندن: صفحہ ۱۰۹' ۲۔ ایضاً: صفحہ ۲۰۶

۳۔ Gail Minault : Saiyyid Mumtaz Ali and Huqooq e Niswan;An Advocat of women's Rights in Islam in the late Nineteenth Century, Modern Asian studies, Vol. 24, No. 1, Febraury 1990, Cambridge University Press.

۴۔ The Times of New Delhi, Janaury 20, 2015

۵۔ سرسید احمد خان پنجاب میں : صفحہ ۱۴۴

۶۔ مکمل مجموعہ لیکچرز سیریز : صفحہ ۴۱۰

۷۔ سرسید کا اصلاحی مشن: از ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحہ ۱۲۵' ۸۔ ایضاً :صفحہ ۱۴۳' ۹۔ ایضاً : صفحہ ۱۲۱' ۱۰۔ ایضاً : صفحہ ۱۹۹' ۱۱۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۹' ۱۲۔ سرسید احمد خان سفرنامہ لندن : مرتبہ۔ شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۰ء ، صفحہ ۶۱۔۶۲' ۱۳۔ سرسید کے خطوط: مرتبہ وحیدالدین سلیم، ایڈیٹر معارف حالی پریس پانی پت۔ ۳۸

۱۴۔ avid Lelyveld : Saiyyid Ahmad's Problems with Women, p2 (Unpublished article)

☆☆☆

ناہیدہ خاتون
ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو و فارسی' ویر کنور سنگھ یونیورسٹی' آرا' بہار
موبائل: 9473849981

مضامین

www.urduacademyts.com

جموں وکشمیر کا معتبر و مستند محقق: پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے کارناموں کی فہرست بڑی ہی طویل ہے جس کو جموں وکشمیر میں اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں رقم کیا جائے گا۔ انھوں نے اپنی مسلسل محنت اور لگن سے اردو کے کلاسیکی ادبی سرمائے کی تحقیق میں نمایاں اضافے کیے ہیں جس میں میر تقی میرؔ، میر ببر علی انیسؔ، مرزا سلامت علی دبیرؔ، مرزا اسداللہ خان غالبؔ، علامہ سر محمد اقبالؔ اور اسی پائے کی شخصیات کی حیات اور کارناموں کے کتنے ہی پوشیدہ گوشوں کو عالمِ وجود میں لایا۔ اکبر حیدری کشمیری کو کلاسیکی اردو ادب پر خاص نظر تھی اور ان کی توجہ سے بہت سا ادبی سرمایہ وقت کی گرد کے نیچے دفن ہونے سے بچ گیا، جس سے آنے والی نسلوں کے لیے انھوں نے فکر و تحقیق کا سامان فراہم کیا۔ تحقیق، تصنیف و تالیف میں وہ اعلیٰ معیار کے قائل تھے۔ ہمیشہ جو بھی تحقیقی بات کرتے اسے ٹھوس شواہد سے ثابت کرتے ہیں۔

ادبی شخصیت کی قدر و قیمت کا تعین اس کی نگارشات کی خوبیوں اور خامیوں کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ادبی قلم کار کے وجود کی مکمل شناخت و دریافت کے لیے اس کے سوانحی حالات و کیفیات، پیدائش و پرداخت، تعلیمی ماحول اور معاشرے کی واقفیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ خاص کر جب بات کسی مستند ادبی شخصیت اور تحقیقی کارناموں کے انبار لگانے والے کی ہو، تو ادبی شخصیت کو اس کی تحریروں کی روشنی میں ہی نہیں بلکہ اس کے ذاتی اور عصری حالات کے تناظر میں بھی دیکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ادیب کی نگارشات میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ ذاتی اور عصری حالات سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ادیب کا مطالعہ و مشاہدہ، ذوق و شوق، خلوص و لگن وغیرہ ادب کے کسی مخصوص میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے آباواجداد، صدیوں سے کشمیر میں آباد تھے۔ ان کا خاندان متوسط طبقے کا تھا لیکن عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں تھی۔ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے والد گرچہ نوا کدل میں درزی کا کام کرتے تھے لیکن اپنی شرافت اور عبادت و ریاضت کی بنا پر علاقے کے باعزت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کا اصلی نام ایم اکبر حیدری، قلمی نام اکبر حیدری کشمیری تھا۔ ان کی پیدائش 13/ اکتوبر 1929 میں سری نگر، کشمیر کے ایک قدیم محلّہ خانقاہ سوختہ میں ہوئی۔ اس محلّہ کو یہ عزاز حاصل ہے کہ وہاں سلاطین چک کے مجتہد بابا خلیل اللہ کی بہت بڑی خانقاہ ہے۔ بچپن سے ہی انھیں علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے دس سال کی عمر میں پہلا نوحہ لکھا اور اسے ایک محفل میں پیش کیا۔ ان کی یہ اولین تحریر فقہ جعفری کے اس وقت کے جید عالمِ دین مولوی جواد صاحب مرحوم کی نظر سے گزری۔ مولوی جواد صاحب نے اس کمسن

www.urduacademyts.com

اکبر کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ تم جعفری ہو؟ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے جواباً سر ہلایا، مولوی جواد صاحب نے انھیں کہا ''آج سے تم حیدری ہو'' اس کے بعد اکبر، اکبر حیدری کے نام سے معروف ومشہور ہوئے اور سارا خاندان حیدری لقب سے ملقب ہوا۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے والد کا نام ایم جعفر اور والدہ کا نام رحمت بیگم تھا۔ والد نے انھیں روایت کے مطابق پہلے مکتب میں دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے داخل کیا۔ مکتب میں انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبانوں اوران کے ادب کا مطالعہ کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی ادبیات کے مطالعے نے تحقیقی کاموں میں ان کی کافی مدد کی۔ اس کے بعد انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول رنگہ ٹینگ، نواکدل میں داخل کیا گیا۔ جہاں سے انھوں نے 1944 میں اچھے نمبرات حاصل کر کے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ علم کی پیاس نے انھیں بی۔اے آنرز کے لیے پنجاب یونی ورسٹی لاہور کا رخ کرنے پر مجبور کیا اور وہاں سے انھوں نے 1947 میں بی۔اے آنرز پاس کیا۔ منشی فاضل کا امتحان 1949 میں جموں وکشمیر یونی ورسٹی سے پاس کیا۔ 1950ء میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔ اسی یونی ورسٹی سے 1952 میں امتیاز کے ساتھ ایم۔اے اردو کی ڈگری پاس کی اور 1956 میں فارسی میں بھی ایم۔اے کیا۔ یہ ڈگریاں انھوں نے پرائیوٹ موڈ میں کیں۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے 1957 میں پی ایچ۔ڈی کے لیے داخلہ لیا اور ڈاکٹر مسعود حسین خان نے انھیں مقالے کا عنوان بھی دیا تھا لیکن یہ عنوان انھیں پسند نہیں آیا تھا اس لیے اس پر کام کرنے سے گریز کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:۔

''1957 میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے پی ایچ۔ڈی کے لیے ایک مقالہ تجویز کیا۔ عنوان یہ تھا ''اردو اور کشمیری گرامر کا تقابلی مطالعہ'' یہ مقالہ میرے لیے مشکل تھا، اس لیے اسے ترک کر کے لکھنؤ یونی ورسٹی میں پروفیسر یوسف حسین کی زیر نگرانی ''میر انیسؔ بحیثیت رزمیہ شاعر'' کے موضوع پر 1960 میں ڈگری حاصل کی۔''
(شیرازہ، گوشۂ پروفیسر اکبر حیدری، مضمون ''میرا تحقیقی سفر''، اکبر حیدری، ص-13)

لکھنؤ یونی ورسٹی سے انھوں نے پروفیسر سید یوسف حسین موسوی کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری 1960 میں حاصل کی۔ پانچ سال کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی سے ہی ڈی۔لٹ کے لیے مقالہ لکھنے لگے۔ جس کا عنوان ''اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا'' تھا۔ ڈی۔لٹ میں ان کے نگراں شبیہ الحسن نونہروی تھے۔ یہ مقالہ انھوں نے 1973 میں جمع کیا تھا۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے اپنی ملازمت کا آغاز 1950 میں کیا تھا جب انھوں نے صرف ادیبِ کامل اور منشی فاضل کامیاب کیے تھے۔ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کا

مضامین

www.urduacademyts.com

یہ اقتباس اس حوالے سے ملاحظہ کیجیے:۔

'' میرا تقرر بحیثیت اردو لکچرر محکمۂ تعلیم میں 1950 میں اس وقت ہوا جب میں بی۔اے (آنرز)، ادیب کامل اور منشی فاضل تھا۔اس زمانے میں جموں وکشمیر کے تمام اعلیٰ تعلیمی ادارے پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ملحق تھے۔ ادیب کامل کی ڈگری اردو میں ایم۔اے کے برابر تسلیم کی جاتی تھی۔''

(شیرازہ، گوشۂ پروفیسرا کبر حیدری، مضمون '' میرا تحقیقی سفر۔''اکبرحیدری،ص۔13)

اکبرحیدری نے جموں وکشمیر کے مختلف تعلیمی اداروں میں اپنے فرائض بحیثیت استادنہایت خوش اسلوبی اور ایمانداری سے انجام دیے۔ پہلے 1950 سے 1953 تک ایس۔پی کالج سری نگر میں لکچرر کی حیثیت سے پڑھاتے تھے پھر سوپور ڈگری کالج بارہمولہ میں 1954 سے 1957 تک اپنی خدمات انجام دیتے رہے پھر یہاں سے تبادلہ ہو کے 1958 سے 1961 تک اننت ناگ ڈگری کالج میں تعینات ہوئے۔اس کے بعد جموں میں 1962 سے 1964 تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔1965 میں انھیں پھر سے امرسنگھ کالج سری نگر میں 1983 تک ملازمت کرنی پڑی۔امرسنگھ کالج میں انھیں پرنسپل شپ کی آفر کی گئی لیکن انھوں نے اپنی ادبی مصروفیات کے پیش نظر یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔البتہ سرکار نے ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر انھیں پرنسپل کا گریڈ عطا کیا۔1975 میں ریاستی سرکار نے انھیں کیبنٹ آرڈر(Cabinet order) کے تحت ممتاز اسکالر، ہونہار اور محنتی استاد قرار دیا۔(آرڈر نمبر۔ 365-C of 1975)

پروفیسرا کبر حیدری کشمیری 1982 میں شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی میں بحیثیت ریڈر مقرر ہوئے تھے۔سینٹرل یونی ورسٹی آف حیدر آباد کے شعبۂ اردو میں بحیثیت پروفیسر 1987 میں تعینات ہوئے اور وہیں سے 1990 میں اپنی طویل ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ 1990 میں تین سال کے لیے انھیں لکھنؤ یونی ورسٹی میں اعزازی پروفیسر(Emeritus Professor) کے طور پر تعینات کیا گیا۔پروفیسرا کبر حیدری کشمیری نے تحقیق کے میدان میں آنے کے بعد تقریباً اپنی زندگی کا تہائی حصہ لکھنؤ میں گزارا۔ یہ قیام زیادہ تر لائبریریوں تک رسائی کے لیے ہوتا تھا۔خود اکبر حیدری اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں لکھنؤ میں گزشتہ 45 برسوں سے ہر سال کم و بیش چار مہینے قیام کرتا ہوں۔ یہاں کے سبھی چھوٹے بڑے کتب خانے کھنگالے ہیں۔ان میں راجہ صاحب محمود آباد، مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ اور خدا بخش لائبریری پٹنہ بھی متعدد بار کتابوں کی تلاش وجستجو میں گیا ہوں۔آج کل کتب خانہ شبلی نعمانی (ندوہ) اور ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونی ورسٹی جاتا ہوں۔'' (شیرازہ، گوشۂ پروفیسرا کبر حیدری، مضمون '' میرا تحقیقی سفر۔''اکبرحیدری،ص۔14)

مضامین

www.urduacademyts.com

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کو لکھنؤ سے اتنی محبت کیوں تھی اور تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے تقریباً ہندستان کا ہر کتب خانہ کھنگالا، ملازمت کے دوران جہاں بھی وہ گئے وہاں کوئی نہ کوئی تحقیقی مقالہ ضرور لکھا۔ یہ بات ضمنی طور پر لکھنؤ کے حوالے سے آئی تھی۔

پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری نے لگ بھگ اسّی (80) تصانیف قلم بند کی ہیں جن میں تقریباً نصف درجن تصنیف 1950 سے 1960 کے دوران نقل مکانی میں کھوگئی تھی۔ کچھ کتابیں جو پاکستان میں شائع ہوئیں وہ اس وقت کے ہندوپاک کے حالات کی نذر ہوکر مصنف تک نہیں پہنچ پائیں۔ اکبر حیدری کی اولین تصانیف دستیاب نہ ہونے کے برابر ہے اور خستہ حالت میں ہیں۔ ان کی تصانیف کے تین ادوار ہیں۔ پہلا دور وہ کتابیں جو انھوں نے 1950 سے 1960 تک لکھیں۔ اس دور کی پہلی تصنیف دیوان ذوقؔ جو 1950 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنے استاد کے نام منسوب کیا ہے جن کا نام پنڈت نندہ لعل کول طالبؔ کاشمیری تھا۔ دوسرا دور 1961 سے 1990 تک کا ہے اور تیسرا دور 1991 سے 2012 تک کا ہے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی نظر گہری تھی۔ وہ چشم پوشی کے قائل نہیں تھے۔ جرأت اختلاف ان کی شخصیت میں سائے کی طرح تھا۔ ان کی عالمانہ زد میں مشاہیر وقت بھی آئے اور اہم علمی و ادبی شخصیات بھی۔ لیکن انھوں نے غیر جانب داری اور استدلال سے ہمیشہ کام لیا۔

اکبر حیدری ایک بے باک اور نڈر محقق تھے۔ وہ حق بات کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بعض اوقات اپنے پیشرو اور بزرگ محققین کی آرا سے صاف لفظوں میں اختلاف کیا ہے۔ وہ اپنی بات کو آرائش گفتار کی نذر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ اسی حق گوئی اور بے باکی سے اردو دنیا میں ان کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے تحقیقی میدان میں اپنی الگ پہچان قائم کی ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کا جو کلام گوشۂ گمنامی میں چلا گیا تھا۔ اس کی اکبر حیدری نے ایک نئی آن بان کے ساتھ بازیافت کی ہے۔ اور ان ادیبوں اور شاعروں کے ادبی کارناموں پر حائل پردہ ہٹایا۔ انھوں نے بالکل ایک جوہری کی مانند گمشدہ لعل و جواہرات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور گردِ غبار سے صاف کر کے انھیں زیب و زینت سے نوازا ہے، چاہے وہ میر تقی میرؔ خدائے سخن کی بات ہو یا انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ گویانِ کربلا کی۔ غالبیات اور اقبالیات کے سلسلے میں بھی وہ یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کے تئیں اکبر حیدری نے تحقیق کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کا یہ تحقیقی کام قابل ستائش ہے۔

پروفیسر اکبر حیدری نے اپنی زندگی کا آغاز تحقیق و تنقید نگاری سے ہی کیا ہے۔ جن دنوں وہ علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی میں ایم۔ اے کررہے تھے۔ ان ہی دنوں انھیں اس دور کی عظیم ادبی شخصیتوں اور دانشوروں سے ملنے کا موقع ملا، جن سے اکبر حیدری نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ 1974 سے 1975 تک ڈائریکٹر لائبریری بھی رہے۔ کشمیر یونی ورسٹی

www.urduacademyts.com

کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے طلبا میں تحقیقی ذوق پیدا کرنے کی کوشش بھی کی اور کئی نادر تحقیقی مقالے لکھے جو شعبۂ اردو کے تحقیقی مجلّہ ''بازیافت'' اور ہندو پاک کے دیگر رسالوں میں شائع ہوئے۔ 15/اکتوبر 1987 میں اکبر حیدری کا تقرر یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں پروفیسر کے عہدے پر ہوا۔ حیدرآباد میں اپنے قیام کے دوران اکبر حیدری نے سینٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد اور عثمانیہ یونی ورسٹی کی لائبریوں کے علاوہ سالار جنگ میوزیم اور دیگر چھوٹی بڑی لائبریریوں میں متعدد قلمی اور نادر و نایاب نسخوں کی بازیافت کی اور کئی تحقیقی مقالے لکھ کر شائع کروائے۔ان میں سے بعض مقالے ایسے ہیں جنھیں اردو دنیا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) نے اکبر حیدری کو ان کی عظیم الشان ادبی خدمات دیکھتے ہوئے لکھنؤ یونی ورسٹی کے تحت پروفیسر امرٹیس (فیلوشپ) کے اعزاز سے نوازا ہے۔ یہ پہلے کشمیری ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔لکھنؤ کے قیام کے دوران اکبر حیدری نے دبیرؔ اور اقبالؔ کے حوالے سے متعدد نایاب تخلیقات اور اشعار کی بازیافت کی اور ان پر مقالے لکھ کر شائع کروائے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے اگر کسی صنف میں زیادہ تحقیقی کام کیا ہے تو وہ اردو مرثیہ ہے۔ مرثیہ نگاری میں انھوں نے بہت سارے مرثیے نگاروں کا غیر مطبوعہ کلام منظر عام پر لایا ہے۔گرچہ مرثیہ کی تحقیق کے ضمن میں یوں تو کئی محققین کے نام آتے ہیں جن میں مسعود حسن خان رضوی ادیب، پروفیسر شبیہ الحسن، ڈاکٹر نیر مسعود، محمد زماں آزردہ اور کاظم علی خان وغیرہ شامل ہیں لیکن ان تمام محققوں کے ساتھ ساتھ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں پر بہت اچھا کام اکبر حیدری نے بھی کیا ہے۔ ان کی کئی تصنیفات ایسی ہیں جس میں مرثیہ، مرثیہ کے ارتقا اور گمنام مرثیہ نگاروں کے بارے میں قیمتی خیالات اور نادر تحقیقی انکشافات ملتے ہیں۔

پروفیسر اکبر حیدری کا دوسرا خاص موضوع اقبالیات رہا ہے۔ اس میں بھی انھوں نے اہم کتابوں کا اضافہ کیا ہے اور علامہ اقبالؔ کے پوشیدہ خزانوں کا عکس بھی ہیں۔ اکبر حیدری نے رسالہ ''حکیم الامت'' نکالا جس میں اقبالؔ پر زیادہ مضامین لکھے جاتے تھے۔اس کے علاوہ اکبر حیدری نے مرزا غالبؔ پر بھی کچھ تحقیقی مقالے قلم بند کیے ہیں۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے دیوان، تذکرے اور شخصیتوں پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ان میں دیوان میر تقی میرؔ، دیوان ذوقؔ، دیوان قائمؔ، دیوان ترقیؔ وغیرہ ہیں۔ تذکروں میں تذکرۂ بہار بے خزاں، تذکرۂ شعرائے ہندی، تذکرۂ گردیزی، تذکرۂ ریختۂ گویاں، تذکرۂ قدیم شاعرات وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

شخصیتوں میں سر تیج بہادر سپروؔ، پنڈت رتن ناتھ درسر شار، پنڈت نندہ لعل کول طالب کاشمیری (یہ اکبر حیدری کے استاد تھے)، جھاؤ لال، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، واجد علی شاہ، آصف الدولہ وغیرہ ان شخصیات پر بھی ان کی اچھی خاصی کتابیں ہیں۔ان تصانیف میں زیادہ کتابیں تحقیقی زمرے میں آتی ہیں اور کچھ تنقیدی بھی ہیں لیکن ان کے مزاج میں بھی تحقیق جھلکتی ہے اس لیے تنقیدی تصانیف میں بھی تحقیقی آثار نظر آتے ہیں۔

مضامین

www.urduacademyts.com

پروفیسر اکبر حیدری کی شناخت اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ اور مایہ ناز محقق، مدیر، مترجم اور مرتب کی حیثیت سے ہوتی ہے۔انھوں نے 83 برس کی عمر پا کر اس دارِ فانی سے کوچ کیا یعنی 18 ستمبر 2012 مطابق 30 شوال 1433ھ میں علمی اور ادبی حلقوں کو صدمہ دے کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلے گئے۔ان کی وصیت کے مطابق ان کے لوحِ مزار پر اقبالؔ کا وہ شعر کندہ کیا گیا ہے جو انھیں بہت پسند تھا۔ان کا مزار ہمدانیہ کالونی، بمنہ سری نگر میں واقع ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری کی موت اردو میں تحقیق کی موت سے کم نہیں ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید اپنے مضمون ''اکبر حیدری اردو تحقیق کی روشن شمع''، میں لکھتے ہیں:

''اکبر حیدری کی موت اردو میں تحقیق کی موت ہے۔قاضی عبدالودود، عرشی رام پوری، مالک رام، جعفر علی خان اثر اور مشفق خواجہ کے بعد اگر جمیل جالبی کا نام نامی الگ کر دیں تو اکبر حیدری کے سوا کس کا نام لیا جائے کہ جس نے اردو میں تحقیق کی آبرو بچائے رکھی ہو۔''

پروفیسر اکبر حیدری کی وفات سے اردو میں تحقیق و تلاش، دریافت و بازیافت اور تصنیف و تالیف کا ایک روشن باب مکمل ہوا۔کتب خانوں اور لائبریریوں میں نہ جانے کتنے ایسے مسودے اور کتنی ایسی کتابیں ہیں جنھیں صرف انھوں نے پڑھا تھا اور صرف وہ پڑھ سکتے تھے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے کام سے قلم کے مسافروں کو تحریک ملتی رہے گی۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں کی قدر و منزلت عوام و خواص پر آشکار ہو جائے گی۔ان کی علمی و ادبی رفعتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے ہمیشہ کمیاب، نادر و نایاب، قلمی نسخوں، غیر مطبوعہ کلام اور اضافی و الحاقی ادبی مواد کی تلاش و جستجو کی۔ کشمیر سے لے کر لکھنؤ اور حیدر آباد کے کتب خانوں کو کھنگالتے رہے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری بڑی عرق ریزی سے کام کرتے تھے اس لیے ان کی شہرت کا چرچا ہندستان اور پاکستان کے علاوہ کینیڈا، جرمن اور امریکہ وغیرہ کے ملکوں میں بھی ہوا۔

المختصر پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی تحقیقی نظر نے بے شمار پوشیدہ ادبی خزانوں کی تلاش کی۔جس کے نتیجے میں اردو کے کئی پوشیدہ حقائق منظرِ عام پر آئے۔ اکبر حیدری کی خدمت یاد رکھے جانے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے پردہ خفا میں کئی شعرا کا کلام اردو دنیا سے متعارف کرا دیا۔انھیں تحقیق میں نہ صرف جموں و کشمیر کے سرفہرست محقق مانا جاتا ہے بلکہ ہندستان کے اہم محققوں میں بھی ان کا نام گنا جاتا ہے۔انھوں نے جو مرثیہ پر تحقیقی کام انجام دیا ہے وہ تا ابد انھیں زندہ جاوید رکھے گا۔اس لحاظ سے جموں و کشمیر تحقیق میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے بلکہ اردو ادب کے مختلف شعبوں میں جموں و کشمیر کا نام توقیر سے لیا جاتا ہے۔

☆☆☆

سجاد احمد صوفی
ریسرچ اسکالر، یونی ورسٹی آف حیدر آباد
پتہ: حاجن، بانڈی پورہ، کشمیر پن کوڈ: 193501
رابطہ: 6005000136

www.urduacademyts.com

بچوں کی نشو ونما میں ماؤں کا کردار

اولاد قدرت کا نہایت قیمتی اور انمول تحفہ ہے۔ان کی خوبصورتی اور معصومیت ہر کسی کا دل موہ لیتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس کائنات کی تمام تخلیقات میں سب سے دلکش شاہکار بچے ہی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ بچے جنت کے پھول ہیں مگر دنیا میں بھی یہ جس جگہ ہوتے ہیں اپنی شوخیوں، کلکاریوں اور شرارتوں سے گلزار بنادیتے ہیں۔یہ کسی بھی قوم کا بیش قیمت سرمایہ ہیں لہذا ان کی مناسب تعلیم وتربیت، بروقت نگہداشت،خصوصی توجہ و دیکھ بھال،اساتذہ و سرپرستوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔چونکہ عمر کے ابتدائی حصے میں بچے بالخصوص اور اخیر عمر میں بالعموم ماؤں کے قریب ہوتے ہیں۔اس لئے ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ماؤں پر زیادہ ڈالی گئی ہے۔ماں کی گود کو بچے کا پہلا اسکول قرار دیا گیا ہے۔نپولین بونا پارٹ کا کہنا ہے ''تم مجھے پڑھی لکھی مائیں دو میں تمہیں پڑھی لکھی قوم دوں گا''۔یوں تو بچوں کی تعلیم وتربیت کا باضابطہ آغاز مدرسے میں داخلہ لینے سے ہوتا ہے مگر ماہرین نفسیات وتعلیمات کا دعوی ہے کہ بچہ دنیا میں آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی بہت سی چیزوں کو دیکھنا اور جاننا شروع کردیتا ہے بلکہ کچھ ماہرین کا تو یہاں تک کہنا ہے رحم مادر سے ہی بچہ بہت کچھ سیکھنے کی شروعات کرچکا ہوتا ہے۔

''حاملہ خواتین کے لیے خاص پیغام ہے کہ ان کے بچے دوران حمل ہی آوازوں کو سننا، سمجھنا اور یاد کرنا شروع کردیتے ہیں اور ان کے دماغ معلومات حاصل کرنے کے لیے پیدائش کا بھی انتظار نہیں کرتے''(Denise Mann 2013)

پیدائش کے بعد بچے کی تعلیم وتربیت کا اولین اور اہم ادارہ گھر ہوتا ہے۔ پیدائش سے لے کر چار پانچ سال کی عمر تک بچے کی ساری سرگرمیاں گھر کی چہار دیواری تک محدود رہتی ہیں، گھر کے افراد اور گھریلو ماحول کا جو اثر بچہ قبول کرتا ہے وہ بہت دور رس اور دیرپا ہوتا ہے۔یہیں سے وہ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا اور بات چیت کرنا سیکھتا ہے۔یہیں سے محبت وشفقت، ہمدردی وتعاون جیسے جذبات کی آبیاری ہوتی ہے۔اسی طرح بچہ نشونما کے مختلف ادوار سے گزرتا ہوا سن بلوغت کو پہنچ جاتا ہے اور پختگی حاصل کرتا ہے۔بچوں کی ذہنی وجسمانی، جذباتی وسماجی اور اخلاقی وروحانی نشو ونما کی تکمیل کے تمام مراحل کے دوران قریب ترین ہستی اس کی ماں ہوتی ہے۔ویسے تو مائیں بچوں کے نفسیاتی تقاضوں سے بڑی حد تک باعلم ہوتی ہیں اور انہیں دوران تربیت ملحوظ بھی رکھتی ہیں تاہم کچھ لازمی امور ایسے بھی ہیں جن سے شعوری واقفیت ضروری ہے۔خصوصاً نشونما کے مختلف مراحل اور اس کے خواص و حوائج سے ذرا بھی غفلت برتی گئی تو بچے کی

www.urduacademyts.com

شخصیت متاثر ہوسکتی ہے اور مختلف نفسیاتی مسائل سامنے آسکتے ہیں۔

نشونما کے لحاظ سے ماہرین تعلیم ونفسیات نے بچے کی عمر کومندرجہ ذیل زمروں میں منقسم کیا ہے:

۱۔شیرخوارگی (6-Infancy..0)

۲۔طفولیت (12-Childhood..6)

۳۔نوبلوغت (18-Adoescence..12)

۴۔بلوغت (Adulthood.. After adolescence period)

ویسے تو یہ چاروں ہی زمرے اپنے آپ میں غیرمعمولی اہمیت رکھتے ہیں مگر تعلیم وتربیت اور طرز برتاؤ کی تشکیل وکردار سازی کے لحاظ سے ابتدائی تین مرحلے یعنی شیرخوارگی، طفولیت ونوبلوغت خاص اہمیت کے حامل ہیں، جن کا تفصیلی علم ماؤں کے لئے ضروری ہے۔ ذیل میں بالترتیب نشونما کے مختلف مراحل اور دیگر پہلوؤں کی انفرادی خصوصیات کو پیش کیا جارہا ہے۔

شیرخوارگی: جسمانی و ذہنی نشونما: پیدائش سے چھ سال کی عمر کے ابتدائی تین سالوں میں نشونما کی رفتار اخیر کے تین سالوں کی بہ نسبت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ بیٹھنے، کھڑے ہونے، چلنے اور چیزوں پر گرفت بنانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ دانت نکل آتے ہیں، اعصاب مضبوط ہوجاتے ہیں، اعضا اور حواس خمسہ سرگرم ہوجاتے ہیں۔شیرخوارگی کے ابتدائی مرحلے میں جب کہ بچے کی تغذیہ کا بنیادی ذریعہ صرف ماں کا دودھ ہے اس کے وزن اور قد وقامت کا انحصار بڑی حد تک ماں کی صحت اور غذا کی فراہمی پر ہوتا ہے، اس دوران ماؤں کی ذمہ داری ہے کہ بچے کی صحت مند غذا کی فراہمی پر خصوصی توجہ دیں ورنہ جسمانی لحاظ سے نقص پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور پھر جسمانی اہلیت کے کمزور بچے سماجی زندگی میں بھی صحیح رویہ نہیں برت پاتے ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ پیدائش کے ساتھ ہی بچے کی ذہنی نشوونما کا آغاز ہو جاتا ہے اس کا ہر مشاہدہ ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ابتدا میں چیزوں کو دیکھ کر اس کے بعد چھوکر اور جب وقوفی نشونما اور وسیع ہو جاتی ہے تو تجربہ کر کے سیکھنے لگتا ہے۔

''ماہرین نفسیات کے مطابق پیدائش سے تین سال کی عمر تک بچے کی ذہنی نشونما بہت تیز رفتار ہوتی ہے جہاں تک اس کے دماغ کی بات ہے وہ آسان سے مشکل کی جانب ترقی کرتا ہے۔اس کے خلیات (Cells) میں اضافہ ہوتا ہے''۔(آفاق ندیم: تعلیمی نفسیات کے پہلو)

تین سے پانچ سال کی عمر میں بچوں کا دماغ مضبوط ہونے لگتا ہے۔قوت تخیل اور قوت حافظہ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور تجسس کی جبلت بھی اس دور کا اہم خاصہ ہے۔ پانچ سے چھ سال کی عمر کے دوران بچوں کے اندر استدلالی اہلیت پروان چڑھتی ہے۔

سماجی وجذباتی نشونما: پہلے سال میں غصہ، خوف اور

www.urduacademyts.com

محبت کے جذبات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ایک سال کے بچے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سبھی لوگ خصوصا قریبی لوگ صرف اسی سے پیار کریں، ابتدائی دو سالوں میں بچہ بہت زیادہ Ego Centric ہوتا ہے اور صرف اپنی خوشی کا احترام کرتا ہے، دو سال کی عمر مکمل ہوتے ہوتے وہ والدین کی خوشی کا بھی لحاظ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تین سال کی عمر پوری ہونے تک دوسرے بچوں سے محبت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور دیگر بچوں کے ساتھ گروپ بندی شروع کر دیتا ہے۔ ان کی خوشی وغم میں شریک ہونے لگتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس کی سماجی نشوونما ہونے لگتی ہے۔ چھ سال کی عمر کو پہنچنے تک بچہ معاشرے کی زبان بولنے لگتا ہے۔ چھوٹوں سے پیار ومحبت اور بڑوں کا ادب واحترام شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح سماجی تانوں بانوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

عہد شیر خوارگی کے اہم خواص: شیر خوارگی کے زمانے میں بچے کے اندر ذہنی و جسمانی نشوونما کی تیز رفتاری، تقلید اور اعادہ کی جبلت، تجسس وتخیل کی قوت میں اضافہ، کھیل کود کی فطرت، جذبات کے اظہار اور ضروریات کی تکمیل میں شدت اور سیکھنے کی تیز رفتاری وغیرہ جیسی صفات وعادات دیکھنے کو ملتی ہیں۔

عہد طفولیت: جسمانی وذہنی نشوونما: اس دور کے ابتدائی تین سالوں میں بچے کی لمبائی اور وزن دونوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اخیر کے تین سالوں میں ان میں پختگی آ جاتی ہے، دودھ کے دانت کی جگہ مستقل دانت نکل آتے ہیں۔ عضلات مزید مضبوط ہو جاتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس دوران لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کی لمبائی اور وزن میں زیادہ اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ۶ سال کی عمر پوری کرتے کرتے بچوں میں شعور وفہم، ادراک وبصیرت، تخیل اور حافظے کی صلاحیت کا نشو ونما ہوتا ہے۔ ابتدائی تین سالوں میں استدلال کی اہلیت اور اخیر کے تین سالوں میں تجزیاتی وترکیبی صلاحیتیں پروان چڑھنے لگتی ہیں جو کہ تصورات کی تعمیر وتشکیل میں معاون ہوتی ہیں۔ اس دوران مسائل کے حل کی صلاحیت بھی پروان چڑھتی ہے۔ بعض بچے دقیق سے دقیق مسئلے بھی منٹوں میں ایسے حل کر دیتے ہیں کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

جذباتی وسماجی نشوونما: زمانہ طفولیت میں بچے نہ صرف جذبات کا بہترین اظہار سیکھ جاتے ہیں بلکہ ان پر قابو پانے لگتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اوصاف دوسروں کی طرف سے مسلط کیے جانے لگے تو ان کے جذبات معدوم ہونے لگتے ہیں، وہ جذباتی کشمکش (Complexes) کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا جذباتی توازن بگڑنے لگتا ہے نتیجتاً ان کا طرز برتاؤ کجی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس دور کے آخری حصے میں گروہ بندی کو بہت زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ وہ زیادہ تر وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتے ہیں۔ سماجی تقریبات اور سرگرمیوں میں خوشی

www.urduacademyts.com

خوشی حصہ لیتے ہیں۔سماجی تعامل زیادہ اور تیز تر ہونے کی وجہ سے دیگر معاشروں کی روایات و اقدار کو تیزی کے ساتھ اپنے اندر جذب کرنے لگتے ہیں۔ اس دور میں مثبت طرز برتاؤ کے ساتھ ساتھ منفی باتوں کی طرف بھی ذہن مائل ہونے لگتا ہے۔مقابلے ومسابقے کی جبلت تیزی سے پروان چڑھتی ہے، بعض دفعہ بچے ایک دوسرے سے برتری حاصل کرنے کے لیے نازیبا حرکات کا ارتکاب بھی کر بیٹھتے ہیں۔ یہ عمر کا بہت ہی نازک دور ہوتا ہے۔اگر بروقت صحیح سمت اور بہتر طرز عمل کی طرف رہنمائی نہ کی جائے تو بچے یقیناً منفی پہلوؤں کو اپنانے لگیں گے اور بالآخر ایک ناقص و ناپسندیدہ شخصیت سامنے آئے گی۔

عہد طفولیت کے اہم خواص: عہد طفولیت میں عموماً بچوں کے اندر خودمختاری، خوداعتمادی، حقیقی زندگی میں دلچسپی، اختراعی صلاحیت کی نشوونما، منطقی واستدلالی قوت فکر کی نشونما، جذبات پر قابو، مقابلہ ومسابقہ، نئی چیزوں کو سیکھنے میں دلچسپی جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔

نوبلوغت:

جسمانی اور ذہنی نشوونما: یہ زمانہ طفولیت اور بلوغت کے درمیان کا زمانہ ہوتا ہے۔ جرشیلڈ کے مطابق ''نوبلوغت وہ زمانہ ہے جس میں نمو پذیر انسان طفولیت سے پختگی کی جانب منتقل ہوتا ہے''۔اس عمر میں نوبالغ بچے کی لمبائی اور وزن دونوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی عضویات کی افزائش ہوتی ہے اور اس میں پختگی آتی ہے۔ابتدائی چند سالوں میں لڑکیوں کے اندر زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بڑھوتری ہوتی ہے اور اخیر کی عمر میں لڑکوں کی نشوونما زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے۔ ہندوستانی ماحول میں لڑکیوں میں 13 سال اور لڑکوں میں 15 سال کی عمر میں جنسی جبلت بیدار ہونے لگتی ہے۔ذہانت کی مکمل نشونما ہو چکی ہوتی ہے۔قوت حافظہ وقوت متخیلہ، فکر واستدلال، تجزیہ وترکیب، تصور وبصیرت اور اختراعیت جیسی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور استحکام آجاتا ہے۔اپنی بات کو مدلل انداز میں مناسب زبان والفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اظہار کرنے لگتے ہیں، زبان کے ساتھ ان کی تحریر میں بھی سلاست وصفائی آنے لگتی ہے۔

جذباتی وسماجی نشوونما: اس عمر میں لڑکے اور لڑکیاں بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔اس دوران محبت وہمدردی، خوف وغصہ، رقابت ومسابقت اور اشتعال کے جذبات بہت تیز ہوتے ہیں۔خوداحترامی کے جذبات اس قدر پائے جاتے ہیں کہ لڑکے جسمانی قوت اور لڑکیاں جسمانی خوبصورتی کے اظہار کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ اس عمر میں بچے مختلف تفکرات اور کشمکش کا شکار ہوتے ہیں۔کبھی اپنے مستقبل کو لے کر تو کبھی سماج میں اپنی حیثیت کو لے کر، ان فکروں کی وجہ سے امید اور قنوطیت کے بیچ معلق رہتے ہیں اور ان میں جذباتی تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس عمر میں ان تمام پہلوؤں کی صحیح

www.urduacademyts.com

سمت میں رہنمائی فراہم نہ کی گئی تو بچے تا عمر جذباتی عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ بچے خود کو اور اپنی صلاحیتوں کو سماجی توصیف و توثیق دلانے پر یقین رکھتے ہیں۔ سماج کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بہ نظر نقد دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، مسائل کے حل کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، حلقہ احباب وسیع ہوتا ہے۔ ایک دو جگری دوست ضرور ہوتے ہیں جن سے وہ اپنے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں، جنسی داعیہ اور صنف مخالفت کے تئیں جاذبیت و کشش زیادہ ہوتی ہے۔ اس عمر میں خود احترامی کے ساتھ ساتھ خدمت خلق اور قربانی کے جذبات کی نشو ونما ہوتی ہے۔

عہد نو بلوغت کے اہم خواص: بلوغت کے زمانے میں جسمانی تبدیلی و جنسی نشو ونما، ذہانت اور وقوفی صلاحیتوں کی نشو ونما، تصوراتی قوت کی کثرت، خود احترامی کے جذبات، اچھی اور بری جبلتوں کی نشونما، آزادی و خود مختاری، مستقبل کے لئے فکرمندی، جذباتی عدم توازن، سماجی خدمت، گروہ بندی و دوستی جیسے اہم اوصاف دیکھنے کو ملتے ہیں۔

نشو ونما کا ہر مرحلہ بچوں کے اندر نئی قسم کی تبدیلیاں لاتا ہے اور ہر تبدیلی شخصیت کو کمال کے درجے تک لے جاتی ہے۔ ان تمام ادوار میں ماں اور بچہ دونوں ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں، لہذا نشو ونما کے مختلف مراحل اور نفسیاتی تقاضوں سے واقفیت، بر وقت توجہ، بنیادی ضروریات کی فراہمی، صحیح تعلیم و تربیت اور بہترین کردار سازی نہ صرف ماؤں کے لئے معاون ہوگی بلکہ بچے کے حق میں بھی مفید و نتیجہ خیز ثابت ہوگی اور پھر یہی بچے اپنی فطری صلاحیتوں اور اہلیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سماج کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ملک و ملت کی تعمیر و تشکیل میں اپنا کردار ادا کر سکیں گے۔

☆☆☆

اسماء فیروز
ریسرچ اسکالر، شعبہ تعلیم و تربیت
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی،
گچی باؤلی، حیدرآباد۔032 500 (تلنگانہ)
موبائل: 8120332602

مضامین

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں ۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروا رہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی، اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

www.urduacademyts.com

اُردو شاعری اور رنگ تصوف بہ حوالہ ڈاکٹر مقصود حسنی

اس عنوان کے حوالے سے دو لفظوں پر جن میں دنیا سمائی ہوئی ہے، قرطاس پر اوقات بھر سجانا ہے۔

تصوف کیا ہے۔؟ شاعری کیا ہے؟

پھر شاعری میں رنگ تصوف پر بحوالہ ڈاکٹر مقصود حسنی بات کرنی ہے۔

''حضرت محمد بن احمد المقری رحمتہ اللہ علیہ'' تصوف باری تعالی کے ساتھ استقامت کا نام ہے۔

حضرت ابو حفص حدود نیشاپوری کے مطابق ''تصوف مکمل ادب ہے، ہر وقت، ہر مقام اور ہر حال میں ادب ہے، جو اوقات ادب قائم رکھے وہ مقام آدمیت پر سرفراز ہوتا ہے''

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے:

''تصوف رسوم و علوم نہیں بلکہ مکمل اخلاق ہے۔ اگر رسوم میں داخل ہوتا تو مجاہدہ ہوتا، اگر علوم کا حصہ ہوتا تو تعلیم ہوتا، فی الحقیقت یہ اخلاق میں شامل ہے، جب تک تو اسے اپنے اندر تلاش نہ کرلے، جب تک تو اسوۂ حسنہ کے مطابق خود کے حالات و معاملات کو ٹھیک نہیں کرے گا، خود کا انصاف نہیں کرے گا تب تک تجھے یہ حاصل نہیں ہوسکتا۔''

حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ''تصوف نیک خلق کا نام ہے''۔

حضرت ابوالحسن ابوشنجہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا:

''تصوف آج کا نام ہے۔ بغیر حقیقت کے یہ اصل میں یہ حقیقت ہے۔ بنا نام کے یہ نام ہے''۔ (کشف المحجوب'' ۔۔۔ عثمان ہجویری)

صحابہ کرام رضوانہ کے زمانے میں اسکا نام نہیں تھا۔ صحابہ کرام رضوانہ کے بعد تابعین کے زمانے میں بھی یہ نام نہیں تھا۔ بس یہ ایک حقیقت تھی، جو سب پر جاری و ساری رہتی تھی۔ جبکہ آج یہ صرف ایک نام ہے۔

المختصر ''تصوف قرآن و سنت کی روشنی میں'' ڈاکٹر غلام قادر لون کے الفاظ میں ''تصوف حال ہے قال نہیں ہے''۔

تصوف تجربہ ہے جس سے گزرا تو جا سکتا ہے، کہا نہیں جا سکتا۔

اب آئیں ذرا شاعری کی طرف بھی نظر ڈال لیں۔ بقول بابا مقصود حسنی شاعری ان امور کی پابند ہے

فکری اور صوتی آہنگ، تبسم، چنچل پن، غنائیت، حسن شعریت کا التزام، تشبیہ استعارہ، علامتیں، تلمیحات، اور شعری صنعتوں کا فطری اہتمام، کم لفظوں میں بہت زیادہ کہنا، ریشمیت، نزاکت، والہانہ پن اور لفظوں کی مرتبہ نشست و برخاست کا نام شاعری ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک ہائیکو دیکھیں:

دیکھ کے چاند مرے آنگن کا

www.urduacademyts.com

جانے کیوں پھیکا پڑ جائے
چنچل روپ بہاروں کا

بقول جون ایلیا:

''دیباچۂ شاید۔ نیازمندانہ سے اقتباس'' شاعر کی فطرت کا ارتفاع، اس کے جمالیاتی زور پر ہوتا ہے۔ یہاں شاعر سے مراد ایک ایسا شخص ہے، جس کے نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ ہم آہنگ ہوکر ایک تخلیقی وحدت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اور یہ تخلیقی وحدت بامعنی صوتی وحدتوں (لفظوں) کی غنائی تالیفات میں صورت پذیر ہوکر شاعری کہلاتی ہے''

الغرض بہترین الفاظ کی بہترین انداز میں ادائیگی شاعری کہلاتی ہے۔ بقول آل احمد سرور:

''اُردو ادب کے کلاسیکل سرمائے پر نظر ڈالئے تو چند مضامین سامنے آتے ہیں۔ اردو ادب کے ارتقا میں تین تہذیبی اداروں کا رول مرکزی ہے۔ بازار، خانقاہ اور دربار۔ اردو زبان کی بنیاد ہندوستانی ہے اور اس کے ادب میں اولین سرمایہ صوفیوں کی دین ہے جن کے یہاں ہندی روایت سے پہلے کام لیا گیا اور عجمی روایت سے بعد میں۔ چھٹی صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی ہجری تک ہندی روایت غالب رہی ہے، وہ ہندی تصوف جو ناتھ پنتھیوں، بھکتی کال اور نرگن واد کی شکل میں رائج تھا۔ ہمارے یہاں خواجہ مسعود سلمان، امیر خسرو، بابا فرید، بوعلی قلندر، شرف الدین یحیٰ منیری، کبیر، شیخ عبد القدوس گنگوہی، شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، علی جیو کام دھنی، گرونانک، میراں جی، شمس العشاق برہان الدین جانم کے یہاں اسلامی تصوف کے ساتھ اپنی بہار دکھاتا ہے اور جب ولی کے وقت سے عجمی اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں تو یہی تصوف فارسی کے رمز و ایما، اشارات اور علامات سے کام لیتا ہے''۔

بابا مقصود حسنی جدید دور کے صوفی اور شاعر ہیں جن کا تعلق تصوف دبستان پنجاب سے ہے، جن کا لقب بھلّے شاہ کا سفید مور ہے۔ قصور جو لاہور سے دو سو کلومیٹر دور ایک شہر ہے، وہاں سے وابستہ ایک صوفی خاندان کے وارث جن کا سیدھا تعلق حضرت سیدنا حسن مثنّی بن حضرت امام حسن رضی اللہ تعالی عنہ سے ہے، کے جانشین بزرگ صوفی، صحافی، ادیب اور شاعر ہیں۔ دنیاوی اعتبار سے کئی ڈگریوں کے مالک شخصیت، کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کو مسٹر اردو آف پاکستان، کنگ آف اردو پاکستان، اور جناتی ادیب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زندگی اور ادب کا کوئی کونا ایسا نہیں جس پر انہوں نے اپنا قلم نہ اٹھایا ہو۔ اب تک آپ پر آٹھ پی ایچ۔ ڈی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ آیئے اب خود ان کی زبانی سن لیں تصوف کیا ہے:

''تصوف ایسا پوشیدہ اور پیچیدہ یا الجھا ہوا فلسفہ نہیں ہے کہ اس کی تہہ در تہہ گتھیاں سلجھائی جائیں۔۔۔ سادہ سی بات ہے، ہاں عمل اتنا آسان بھی نہیں۔ اس کا بنیادی اصول ''میں ناہی سبھ توں'' ہے کچھ قائم بالذات نہیں۔ اسکی ہیئت میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ آخر اس کی موجودہ حالت ختم

www.urduacademyts.com

ہوجاتی ہے۔انسان جملہ مخلوقات سے معتبر ہے۔۔۔معتبر ہونے کے سبب عشق میں مبتلا ہوا۔

عشق کی دوسطحیں ہیں:

پہلی سطح یہ ہے کہ زندگی اسی اطوار سے گزارنا ہے جس اطوار سے گزارنے کا حکم دیا گیا ہے، کسی بھی صورت، حالت، کیفیت، موقع اور ضرورت پر اللہ کا وہ حکم جو حضور ﷺ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اس سے انحراف یا اس سے برعکس کرنے یا کہنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اگر کہتا ہے یا کرتا ہے تو وہ ''میں انہیں سبھ توں'' سے متعلق نہیں ہوتا۔ وہ اس دائرے سے باہر ہوجاتا ہے۔

عشق کی دوسری سطح پر انسان خود عامل ہوتا ہے، دوسروں کو عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ کام انبیاء کرام اور حسین ابن علی رضی اللہ تعالی عنہ جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ وہ احکام اللہ کی عمل داری کے لئے کسی بھی سطح تک جا سکتے ہیں۔ وہ مجسم امر ربی ہوتے ہیں۔

صوفی اور عموم میں فرق ہوتا ہے۔ عموم اچھا کام جنت کی خواہش میں کرتے ہیں جبکہ صوفی جو پہلے ہی اللہ کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے اس پر اللہ کی محبت غالب ہوتی ہے اسے اللہ ہی اللہ درکار ہوتا ہے۔ غالبؔ نے اسی حوالے سے کہا تھا

بس کہ مشکل ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالبؔ

یہ سب کہنے میں آسان اور عمل درآمد میں قطعی آسان نہیں ہے۔ ہر دو صورتوں میں عشاق بہت کم دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ غالب پھر ذہن میں آٹپکے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

غالبؔ

ان کے کلام میں موجود ایک اور ہائیکو دیکھیں جس میں شاعر اور صوفی دونوں موجود ہیں۔

سورج کو روک لو/ شہر عشق کو جانے والا/ کوئی سر سلامت نہیں رہا

آیئے بابا مقصود حسنی کے صوفیانہ کلام کی کچھ نمونے دیکھ لیں۔

بے آنت سمندر/ آنکھ میں پانی/ آب کوثر/ شبنم/ گل ماتھے کا جھومر/ جل، جل کر/ دھرتی کو جیون بخشے/ گنگا جل ہو کہ/ زم زم کے مست پیالے/ دھوڑ الیں کالک کے دھبے/ جل اک قطرہ/ جیون ہے بے آنت سمندر

دوسری نظم حاضر ہے:

اک پل/ آکاش اور دھرتی کو/ رنگ دھنک اچھالے/ دوجا پل/ جو بھیک تھا پہلے کل کی/ کاسے سے اترا/ ماتھے کی ریکھا ٹھہرا/ کرپا اور دان کا پل/ پھن چکر مارا/ گرتا ہے منہ کے بل/ سلوک ہے پاک سہی/ پھر بھی/ حنظل سے کڑوا/ اترن کا پھل/ الفت میں کچھ دیکر/ پانے کی اچھا/ حاتم سے چھل/ غیرت سے عاری/ حلق میں ٹپکا/ وہ قطرہ/ سقراط کا زہر/ نہ گنگا جل/ نیم کا پانی/ نہ کڑوا نہ کھارا/ وہ تو ہے/ آب زم زم/ اس میں رام کا۔ بل/ ہر فرزانہ/ عہد سے مکتی چاہے/ ہر دیوانہ عہد کا بندی/ مرمٹنے کی باتیں/ ٹالتے رہنا/ کل تا کل/ جب بھی/

www.urduacademyts.com

پل کی بگڑی کل/ در نانک کے/ بیٹھا بیکل/ وید حکیم/ ملاں پنڈت/ پیر فقیر/ جب تھک ہاریں/ جس کے ہاتھ میں وقت کی نبضیں/ چل محمد کے در چل

ایک پابند شعر دیکھیں:

تم لئے پھرتے ہو دستار فضیلت
رہتے ہیں لوگ یہاں سر بریدہ
ڈاکٹر مقصود حسنی

میرا اُن سے اگلا سوال تھا:

ایک ادیب، شاعر اور صوفی کے نظریہ تخلیق و خلق میں اور تجربہ میں کیا فرق ہے۔۔

آپ کا جواب تھا:

''غیر صوفی ادیب و شاعر دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مبالغے اور لگی لپٹی سے کام لیتے ہیں۔صوفی شاعر و ادیب جو اور جیسا کی پیش کش کے لئے وجدانی اور والہانہ پن کی تکنیک سے کام لیتے ہیں اور ان کی تان ذات باری پر ہی جا کے ٹوٹتی ہے۔شخصی بے راہ روی کی نشاندہی سے صوفی دور رہتا ہے۔

معاملہ وہی رہتا ہے، لیکن غیر متعلق اور غیر مستعمل طور اور چلن اختیار کرنا تجربہ ہے، اسے رواج ملنا دوسری بات ہے۔''

بابا کی بات سے مجھے علامہ اقبال یاد آئے جن کے تصوف کے سفر کو میں دو اشعار میں بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ جب عشق ہوا تو بیساختہ کہا:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

جب عشق انتہا کو پہنچا تو کہا:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہوں

جب وصل ہوا تو علامہ اقبال صرف یہ دعا مانگ کے رہ گئے:

دیکھا ہے جو کچھ میں نے
اوروں کو بھی دکھلا دے

تصوف وہ رنگ عشق ہے جو چڑھا تو پھر ہر رنگ بے رنگ ہو گیا۔ میرا ایک شعر ملاحظہ کریں:

کیا بتاؤں کہ تیرے جانے سے
کیسی بے رنگ ہوگئی ہوں میں

واپس آئیں۔ بابا مقصود حسنی کی بات ہو رہی ہے تو انہی کی بات چلے۔ان کا کچھ اور رنگ تصوف ملاحظہ ہو:

میں تم کو کیسے سوچ سکوں گا/تم وہاں ہو جہاں میں نہیں/ میں حد، تو ان حد/ میں زمین تو آسمان/ ہاں یہ تشفی ہے/ میں تیری شناخت ہوں/ تو میرے ہونے کا ثبوت ہے/ اب میں تجھے تیری اجازت سے/سوچتا ہوں

اسی رنگ میں میرا ایک شعر:

تیرا ہونا میرے ہونے کی گواہی ٹھہرا
تو نہ ہوتا تو میرا ہونا کہاں ہو پاتا

بابا مقصود حسنی کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو:

مسکان کے بطن سے/ وہ صاحب جلال/ دفعتاً جمال میں آیا/ پھر تھوڑا سا مسکرایا/ مسکان کے بطن سے تو ترکیب پایا/ رتبہ لامکان ملا/ پھر تو سلسلہ چل نکلا/ تیری پلکوں کی حقیر جنبش سے/

www.urduacademyts.com

قطار فرشتوں کی لگ گئی/ تری انگلی کے ارتعاش سے/ مہتاب دولخت ہوا/ جنت بنی سورگ بنا/ ودھی کا یہی ویدن تھا/ سب دیو تخلیق ہوا/ تری زلف کی بے خیالی نے آسمانوں کو وجود دیا/ ستارے بے نشان سے/ ترے ہونے کا نشان ہوئے/ گردشوں کے امکان بنے/ ترے ہونٹ کچھ کہنے کو کھلے/ خالق دوجہان نے/ تیرے ہونٹوں کو/ آئین فطرت کہا/ وہ قطرے سے دریا ہوا/ جس جبین کا تو مقدر ہوا/ جو تجھ سے گیا/ جہان سے گیا، خدا سے گیا۔

اسی رمز میں میرا ایک شعر دیکھیں:

آپ شامل رہے کہانی میں
ورنہ قصہ کہاں مکمل تھا

ایک اور نظم ملاحظہ ہو:

آج یہ کھلا/ جیون کی رگوں سے/ ساری شبنم نچوڑ کر/ کل تک اتارا تا رہا/ آج مگر یہ کھلا/ وہ سب/ ترے عرق جبین کے/ ایک قطرے کا پاسنگ نہ تھا

آپکی تقریباً تمام تر شاعری پر تصوف حاوی ہے اپنے ایک شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کررہی ہوں:

مت دیکھ مرے ظاہری ساغر کو میرے دوست
شاید کہ چیتھڑوں میں چھپا اک گہر ہوں میں

☆☆☆

مہر افروز (افروزہ خانم یعقوب خان پٹھان)
ریسرچ اسکالر جامعہ کرناٹک دھارواڑ
"الرحمان"، تھرڈ فیز۔ کے ایچ بی کالونی
ڈی۔این۔کوپ۔ دھارواڑ 580008 کرناٹک۔
فون:9008953881

پپیتا صحت کے لئے فائدہ مند

پپیتا اپنے اندر بے شمار فوائد سموئے ہوئے ہے۔اس میں وافر مقدار میں مانع تکسیدی اجزاء، وٹامن بی،فولیٹ، پینٹوتھینک ایسڈ، معدنیات، کیلشیم، پوٹاشیم، میگنیشیم، لائکوپین، اور فائبر موجود ہیں۔اس میں تین اہم طاقتور مانع تکسیدی جز وٹامن سی، ای اور اے پائے جاتے ہیں۔ پپیتے میں بہت کم کیلوریز ہوتی ہیں۔100 گرام پپیتے میں صرف تیں کیلوریز ہوتی ہیں۔دیگر غذائی اجزاء معدنیات اور وٹامنز بڑی مقدار میں ہوتے ہیں۔ پپیتے میں بی کمپلیکس وٹامنز جیسے فولک ایسڈ، پائڈوکسن، رائبوفلیون اور تھیامین بھی پائے جاتے ہیں جو غذائی تحلیل کے لئے ضروری ہیں۔ پپیتے کا گودا ہی نہیں بلکہ اس کے بیج اور چھلکوں میں بھی غذائیت کا خزانہ ہوتا ہے۔ پپیتے کے بیجوں اور چھلکوں میں قدرتی فینول سمیت فائٹو کیمیکلز ہوتے ہیں۔ پپیتے میں شامل اجزاء باہم مل کر جسم کو توانائی فراہم کرنے کے ساتھ پٹھوں کے ٹشوز کی شکستگی دور کرکے ان کے دوبارہ احیا میں مدد کرتے ہیں۔سائنسی تحقیقات نے بھی پپیتے کو فائدہ مند بتایا ہے۔پپیتا ایک زود ہضم پھل ہے۔اس کا گودا نرم ہونے کی بنا پر باآسانی ہضم ہو جاتا ہے۔کھانے کے بعد پپیتا کھانے سے غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے۔معدے میں تیزابیت اور بدہضمی بھی نہیں ہوتی اس کی وجہ سے یہ قبض کشا بھی ہے۔ پپیتا دو اہم خامروں پپائن اور کیموپپائن سے لبریز ہوتا ہے۔ پروٹین معدے میں آسانی سے ہضم نہیں ہوتے۔ یہ خامرے غذا کو ہضم کرنے میں معاونت فراہم کرنے کے ساتھ معدے میں پروٹین کو بھی اچھی طرح ہضم کرتے ہیں۔حالیہ تحقیق کے مطابق امینوایسڈز، جسم میں مختلف کیمیائی عمل کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں اور ہماری ذہنی وجسمانی صحت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔عمر بڑھنے کے ساتھ انسانی جسم میں ہاضم خامرے کم بننے لگتے ہیں جس سے پروٹین کے ہضم ہونے کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر معدے میں غیر حل شدہ پروٹین بڑھ جاتے ہیں۔آنتوں میں جراثیم کی افزائش ہوتی ہے اور امینوایسڈز کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔امینوایسڈ کی کمی سے جسم میں ہونے والی اہم کیمیائی تبدیلیاں رُک جاتی ہیں۔ پپیتا سرطان کے خلاف موثر ڈھال ہے۔کولون، جگر اور دیگر جسمانی اعضاء وگلینڈز کے سرطان کے خلاف پپیتے کا استعمال شفا بخش ہوتا ہے۔ پپیتے میں موجود فائبر، کینسر کی وجہ بننے والے زہریلے مادوں کو صحت مند خلیوں میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔ پپیتے میں شامل دیگر اجزاء فولیٹ، وٹامن سی، بیٹا کیروٹین اور وٹامن ای مل کر کولون کینسر کے خطرے کو معدوم کرتے ہیں۔

oOo

مضامین

www.urduacademyts.com

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ اور ملک کی مجوزہ بنیادی تعلیم

تعلیم اور اس کی اہمیت:

اکتساب کی سہولیات کی فراہمی، علم وہنر اور اقدار واخلاقیات کا حصول تعلیم کہلاتا ہے۔ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے اور انسانی زندگی کے ہر مرحلہ میں جاری رہتا ہے جو بطنِ مادر سے شروع ہو کر موت پر ختم ہوتا ہے۔ روزِ اول ہی سے تعلیم کی اہمیت اور ضرورت قائم ہے بلکہ دن بہ دن اس کی قدر اور وقعت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ کوئی معاشرہ، قوم اور ملک تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کرسکا اور مستقبل میں بھی اس کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ اگر کوئی ملک ترقی کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے تمام شہریوں کو اس کے قطع نظر کہ اس کا تعلق کس کلاس، نسل، ذات، علاقہ، مذہب اور فرقہ سے ہے اعلیٰ معیار کی تعلیم مہیا کرے۔ ملک کے شہریوں کو ان کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرنے اور ان کے حقوق کے بابت باخبر کرنے کے لیے بھی تعلیم ضروری ہے۔ جان ڈوئی کے مطابق ''تعلیم زندگی کے لیے تیار کرنا نہیں بلکہ تعلیم ہی زندگی ہے''۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ ''زندگی اس طرح گزاریے گویا کہ کل آپ کی وفات ہے اور علم کا اکتساب اس طرح کیجیے گویا کہ ہمیشہ آپ کو جینا ہے''۔ علم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو ترقی اور خوش گوار زندگی کا ضامن ہوسکتا ہے اور اس کے علاوہ تمام راستے اور ذرائع غیر متیقن ہیں۔ نیلسن منڈیلا نے کہا کہ ''تعلیم ایک سب سے طاقتور ہتھیار ہے جو دنیا کو بدل سکتا ہے''، اور بنجمن فرینکلن نے کہا کہ ''تعلیم میں سرمایا کاری سب سے بہترین فائدہ دیتی ہے''۔ تعلیم تاریکی میں روشنی کی شعاع اور ایک اچھی زندگی کی امید ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تعلیم اس سرزمیں پر موجود ہر فرد کا بنیادی حق ہے اور بغیر تعلیم کے انسان اس سرزمین پر ایک بدترین شے ہے۔ سابق صدر جمہوریہ اور مشہور سائنس داں، ابوالفخر زین العابدین عبدالکلام کا کہنا تھا کہ حقیقی تعلیم انسان کی عزت میں اضافہ کرتی ہے اور اس کی عظمتِ نفس بڑھاتی ہے۔ تعلیم کا مقصد مہارتوں اور صلاحیتوں کا حامل ایک اچھا انسان تیار کرنا ہے اور تعلیم حقیقت میں سچائی کی جستجو ہے۔ تعلیم کے شعبہ میں ہمارے ملک، ہندوستان کا کردار کافی اہم ہے اور اسی وجہ سے تمام تر دشواریوں کے باوجود شرح خواندگی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم کی ترقی کے لیے کافی اقدامات لیے گئے اور کئی کمیٹیاں اور کمیشنز کا قیام عمل میں آیا جیسے انگریزی تعلیم ایکٹ -۱۸۳۵، وڈ ڈسپیچ -۱۸۵۴، ہنٹر کمیشن -۱۹۱۷، سارجینٹ پلان- ۱۹۴۴، یونیورسٹی تعلیم کمیٹی- ۱۹۴۸، ثانوی تعلیم کمیشن- ۱۹۵۲، ہندوستانی تعلیم کمیشن-۶۶- ۱۹۶۴، قومی تعلیمی پالیسی-۱۹۶۸ اور ۱۹۸۶، نیشنل نالج کمیشن-۲۰۰۶، معلوماتی اور مواصلاتی تکنیک سے متعلق قومی پالیسی- ۲۰۱۲ اور نئی تعلیمی پالیسی-۲۰۲۰ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

www.urduacademyts.com

نئی تعلیمی پالیسی-۲۰۲۰

بصیرت

نئی تعلیمی پالیسی-۲۰۱۹ ہندوستانی مرکوز ایک ایسی تعلیمی نظام کی تصویر کشی کرتی ہے جو سب شہری کو اعلیٰ معیار کی تعلیم کی فراہمی کے ذریعہ ہمارے ملک کو پائداری کے ساتھ ایک منصفانہ اور فعال معاشرہ میں تبدیل کرنے میں بلاواسطہ معاون ہو۔

نئی تعلیمی پالیسی ہندوستان کی اکیسویں صدی کی سب سے اہم تعلیمی پالیسی ہے جو چونتیس (۳۴) سال کے ایک لمبے انتظار بعد ۲۰۱۹ میں ایک مسودہ کے شکل میں پیش کیا گیا۔ ہندوستان کی یونین کابینہ نے اس مسودہ کو ۲۹ جولائی ۲۰۲۰ کو اپنی منظوری دی۔ آٹھ افراد پر مشتمل ایک جماعت بشمول چیرمین (ڈاکٹر کے کستوری رنگن)، چھ ممبران اور ایک سکریٹری نے کافی جدوجہد اور تعلیم کے مختلف ماہرین و محققین نیز تمام حصہ داروں سے رجوع کرنے کے بعد اس مسودہ کو تیار کیا۔ اس پالیسی میں اکیسویں صدی کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم کے شعبہ میں سدھار اور بدلاؤ کی سفارش اور وکالت کی گئی ہے۔ یہ پالیسی ہر زاویے سے انقلابی، دوررس اور جامع ہے جو تعلیم کے تمام پہلوؤں جیسے بنیادی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، درس وتدریس، نصاب، تعلیمی نظم ونسق، صنعتی تعلیم، تعلیمی سرمایہ کاری، تعلیم بالغان اور تکنیکی تعلیم وغیرہ پر سیر حاصل بحث کرتی ہے۔ اس پالیسی نے ملک کی تعلیمی ڈھانچہ کے سارے زاویے جیسے قوانین، انتظام اور نظم وضبط وغیرہ میں تصحیح اور سدھار کی پیشکش کی تاکہ ایک ایسا نیا نظام تیار کیا جائے جو اکیسویں صدی کے مقاصد کو پورا کرے۔ اس پالیسی میں ہندوستان کی ایک لمبی تاریخی وراثت اور کئی ہندوستانی محققین کی اختراعات اور تحقیقات کو جگہ دی گئی ہے۔ اس پالیسی کا مقصد تمام شہریوں کو کثیر شعبہ جاتی اور بین مضامین آزاد تعلیم مہیا کرانا ہے۔

ابتدائی بچپن کی تعلیم: پالیسی نے ابتدائی تعلیم کو تنقیدی نظریے سے دیکھا اور اس کا مقصد ۲۰۲۵ تک اس بات کا حصول ہے کہ ۳ سے ۶ سال کے تمام بچوں کو مفت، درست، اعلیٰ معیار کی اور مناسب دیکھ بھال اور تعلیم تک رسائی ہو۔ پالیسی ابتدائی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتی ہے کیوں کہ انسان کی پوری زندگی میں اس وقت کا بڑا کردار ہے۔ مقامی ضروریات، جغرافیہ اور موجودہ ڈھانچہ کے اعتبار سے ابتدائی بچپن کی تعلیمی سہولیات کی توسیع اور اس میں تقویت دی جائے گی اور اس تعلیم کے لئے ایک نصاب اور تعلیمی ڈھانچہ تیار کیا جائے گا۔ فریم ورک میں ۳ سال تک کی عمر کے بچوں کے مناسب ادراکی محرک اور ۳ سے ۸ سال کے عمر کے بچوں کے لئے تعلیمی رہنما اصول شامل ہوں گے۔ ابتدائی بچپن کی تعلیم وزارت تعلیم کے دائرہ کار میں آئے گی (وزارت انسانی وسائل کی ترقی کا نام بدل کر وزارت تعلیم کر دیا گیا ہے) اور وزارت تعلیم، وزارت خواتین اور بچوں کی ترقی اور وزارت صحت اور خاندانی بہبود کی مجموعی کوششوں سے اس تعلیم کو اسکول کی تعلیم سے موثر طریقے سے جوڑا جائے گا۔ اسکول سے قبل کی تعلیم کی تصحیح کے لئے ایک موثر معیاری ریگولیشن یا ایکریڈیشن کا نظام قائم کیا جائے گا۔

www.urduacademyts.com

تعلیم کے حقوق ایکٹ ۲۰۰۹ کی توسیع کی جائے گی تاکہ تمام ۳ سے ۶ عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی معیار کی تعلیم کی دستیابی کو یقینی بنایا جائے۔

بنیادی خواندگی اور ہندسے: درجہ اول سے درجہ پنجم تک کے درجات میں خصوصی توجہ ابتدائی زبان اور ریاضی پر دی جائے گی۔اس کا مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ پانچویں درجہ اور اس سے اعلی درجات کے طلباء ۲۰۲۵ تک بنیادی خواندگی اور ہندسوں حاصل کر لیں۔ یہ پالیسی ابتدائی زبان اور ریاضی کے تعلق سے شدید بحران کو تسلیم کرتی ہے اور اس کی اہمیت اور اعلی ترجیح کا اعتراف بھی کرتی ہے۔ ماقبل پرائمری اور پرائمری اسکول کے طلباء کو ایک مناسب ناشتہ اور دوپہر کا کھانا دونوں فراہم کیے جائیں گے۔اس پروگرام پر ہونے والے اخراجات کو کھانے کی قیمتوں اور افراط زر سے مربوط کیا جائے گا تاکہ اس کی فراہمی یقینی بنایا جا سکے۔ معیاری مواد کی دستیابی اور جانچ کے مضبوط نظام کے ساتھ ساتھ ایک سے پانچویں درجہ میں بنیادی خواندگی اور ہندسوں پر توجہ ہوگی۔قومی اساتذہ پورٹل پر زبان اور ریاضی کے وسائل کا ایک قومی ذخیرہ دستیاب ہوگا۔اساتذہ کو مدد فراہم کرنے کے لئے تکنیکی اختراعات کی آزمائش کی جائے گی اور پڑھنے اور مواصلات کی ثقافت کو فروغ دینے کے لئے سرکاری اور اسکول کی لائبریری میں توسیع کی جائے گی۔ پہلے درجہ کے تمام بچوں کو تین مہینے کی اسکول کی تیاری کے لئے ایک ٹریننگ دی جائے گی۔طلباء اور اساتذہ کے مابین ۳۰-۱ کے تناسب کو ہر اسکول کی سطح پر یقینی بنایا جائے گا۔

بنیادی تعلیم کا نصاب اور درس وتدریس: اسکولی تعلیم کے لیے جدید اور ترقیاتی طور پر موزوں نصاب اور تعلیمی ڈھانچہ جو ذہنی نشوونما اور اکتساب کے اصولوں پر مبنی ہو تیار کیا جائے گا۔ پیشہ ورانہ تعلیم اور تعلیمی اسٹریم کے ساتھ ساتھ تمام مضامین جیسے سائنس، سماجی علوم، آرٹ، زبانیں، کھیل اور ریاضی وغیرہ پر اسکول میں یکساں زور دیا جائے گا۔۲۰۲۲ تک فنِ تعلیم اور نصاب تبدیل کر دیا جائے گا تاکہ اکیسویں صدی کی مہارتوں کی ترقی، تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحیتوں، سائنسی مزاج، مواصلات، تعاون، کثیر لسانی، مسئلے کو حل کرنا، اخلاقیات، معاشرتی ذمہ داری اور ڈیجیٹل خواندگی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔اسکولی تعلیم کے نصاب اور تعلیمی ڈھانچے کو ان کی ترقی کے مختلف مراحل میں سیکھنے والوں کی ترقیاتی ضروریات اور مفادات سے متعلق اور ذمہ دار بنانے کے لئے اس کی تشکیلِ نو کی جائے گی۔اسکول کی تعلیم کے لئے نصاب، تعلیمی ڈھانچہ اور نصابی فریم ورک کی رہنمائی ۴+۳+۳+۵ ڈیزائن کے ذریعہ ہوگی۔

بنیادی (Foundational) مرحلہ (عمر ۳-۸): تیز دماغی نشوونما؛ کھیل کود اور فعّال دریافت پر مبنی تعلیم۔

تعارفی (Preparatory) مرحلہ (عمر ۸-۱۱): کھیل کود اور فعّال دریافت پر تعمیر؛ وضع شدہ اور بناوٹی آموزش کی طرف عبور کا آغاز۔

درمیانی (Middle) مرحلہ (عمر ۱۱-۱۴): مضامین

www.urduacademyts.com

میں تصورات کی آموزش، عبوری عنفوانِ شباب (adolescence) کی شروعات۔

سیکنڈری مرحلہ (عمر ۱۴-۱۸): معاش اور اعلیٰ تعلیم کی تیاری؛ عنفوانِ شباب سے جوانی کی طرف انتقال۔ یہ مرحلہ کثیر جہتی مطالعہ پر مشتمل ہوگا اور موضوع کی گہرائی، تنقیدی سوچ اور زندگی کے مقاصد کی توجہ پر زور ہوگا۔

تمام طلباء کو زبانوں، سائنسی مزاج، جمالیات وفن کا احساس، ابلاغ، اخلاقی استدلال، ڈیجیٹل خواندگی، ہندوستانی علم اور ملک اور دنیا کو درپیش مسائل کی بابت معلومات حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ ایک ایسا لچکدار نصاب ہوگا جہاں طلباء کو از خود مضامین کے انتخاب کا اختیار ہوگا۔ پانچویں درجہ تک لازمی طور پر مادری زبان یا مقامی زبان میں تعلیم دی جائے گی اور ترجیحی طور پر آٹھویں درجہ تک نیز ضرورت کے اعتبار سے دو لسانی طریقہ اپنا یا جاسکتا ہے۔ سہ لسانی فارمولہ کو پورے ملک میں مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا اور زبان کے اساتذہ کی بحالی کے لئے خصوصی قدم اٹھائے جایں گے۔ ۹ سے ۱۲ درجات میں طلباء کو نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ کورسز کی بھی سہولت ہوگی۔ قومی نصاب کے فریم ورک پر نظر ثانی کی جائے گی، نئی نصابی کتب تیار کی جائیں گی اور اعلی معیار کے ترجمے کئے جائیں گے۔ امتحانات اور تشخیص کے موجودہ نظام اور ڈھانچہ میں تصحیح اور سدھار کئے جائیں گے۔

بنیادی تعلیم کی عالمی رسائی: اس پالیسی کا مقصد ۲۰۳۰ تک ۳ سے ۱۸ سال کی عمر کے تمام بچوں کے لئے مفت اور لازمی اعلی معیار کی اسکولی تعلیم کی رسائی اور شرکت کا حصول ہے۔ مختلف اقدامات کے ذریعہ مکمل اسکولی تعلیم میں صد فیصد مجموعی اندراج کے تناسب کو حاصل کیا جائے گا۔ بچوں کو اسکول میں روک کر رکھنے میں ہماری ناکامی پر یہ پالیسی تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ اسکول سے پہلے کی تعلیم میں صد فیصد داخلہ کو یقینی بنانے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ اسکولوں میں داخلہ کی تعداد میں اضافہ، سہولیات کی فراہمی، ذرائع ارسال و تبلیغ اور ہاسٹل کی سہولت نیز خصوصی طور پر لڑکیوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے گا۔ بچوں کی حاضری، امتحانات، اسکول چھوڑنے والے اور اسکول سے باہر کے بچوں کو اسکول میں لاکر آموزش کے عمل میں تمام بچوں کی شرکت کو یقینی بنایا جائے گا۔ آموزش کے متعدد ذرائع جیسے رسمی اور غیر رسمی، فاصلاتی اسکولی تعلیم اور ٹکنالوجی کے پلیٹ فارم مضبوط کئے جائیں گے۔ حق تعلیم ایکٹ (RTE Act) کی ضروریات کو محدود کر دیا جائے گا اور بچوں کے تحفظ، تعلیم تک رسائی اور شمولیت، اسکول کی غیر منفعتی فطرت اور آموزش کے کم سے کم معیار کو یقینی بنایا جائے گا۔ حق تعلیم ایکٹ (RTE Act) کی توسیع کی جائے گی تاکہ اسکول سے پہلے کی تعلیم کی شمولیت کے ساتھ بارہویں (۱۲) درجہ تک مفت اور لازمی تعلیم کی دستیابی کو یقینی بنایا جاسکے۔

مساوی اور معیاری بنیادی تعلیم: اس پالیسی میں متعدد ٹھوس اقدامات کے گئے ہیں تاکہ یہ یقینی بنایا جائے کہ کوئی بچہ

www.urduacademyts.com

پیدائش اور کسی دوسری وجوہات کی وجہ سے آموزش اور حصول علم کے مواقع سے محروم نہ رہ جائے۔ اس پر زور دینے کے لیے ایک تعلیمی زون بھی قائم کیے جائیں گے۔

اساتذہ: باصلاحیت اور صحت منداساتذہ کی بحالی شفاف عمل کے ذریعہ کی جائے گی، ان کی ترقی قابلیت کی بنیاد پر ہوگی اور مختلف ذرائع سے ان کی کارکردگی کی وقتاً فوقتاً تشخیص بھی ہوگی۔ تعلیمی شعبے میں منتظم اور استاذ بننے اور ان کی بحالی کے عمل میں سب کو یکساں مواقع میسر ہوں گے۔ اس پالیسی میں اساتذہ کی ہمارے معاشرے کے سب سے اہم ممبران اور مشعل راہ کی حیثیت سے پیشین گوئی کی گئی ہے کیوں کہ تعلیم کو معیاری بنانے کی تمام تر کوششوں کی بنیاد اساتذہ کے معیار پر ہے۔ پسماندہ، دیہی یا قبائلی علاقوں کے طلباء کے لئے چارسالہ بی ایڈ کورس کے لئے اہلیت پر مبنی وظائف کا آغاز کیا جائے گا اور اساتذہ کی بحالی تمام اسکولوں میں ان کی قابلیت کی بنیاد پر ایک شفاف عمل کے ذریعہ کی جائے گی۔ سب سے پہلے اساتذہ کا اہلیتی امتحان ہوگا جس کے بعد ایک انٹرویو اور تدریسی مظاہرہ ہوگا اور نااہل اور ٹھیکہ کے اساتذہ کی روایت ۲۰۲۲ تک ملک بھر میں بند کردی جائے گی۔ اساتذہ کو غیر تدریسی کاموں سے محفوظ رکھا جائے گا تاکہ بغیر کسی رُکاوٹ کے درس و تدریس کا کام بخوبی انجام دے سکیں۔ اسکول انتظامیہ کمیٹی (School Management Committee) کو حساس بنایا جائے گا اور محکمہ اسکولی تعلیم کے افسران اس ماحول کو بنانے مدد کریں گے۔ اساتذہ اور ان کے معلمین کو ایک محتاط منصوبہ بندی کے ذریعے اعلی معیار کا مواد فراہم کیا جائے گا تاکہ تمام طلباء کی شمولیت کو یقینی بنایا جاسکے۔ تمام اساتذہ کچھ معین سالوں کے تجربہ کے بعد منتظم اور سربراہ اور معلم استاذ بن سکیں گے اور تعلیمی محکمہ کے تمام عہدے ان اساتذہ کے لئے مختص ہوں گے جو انتظامیہ میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

ملک میں مساوی اور جامع بنیادی تعلیم: اس پالیسی کا مقصد ایک ایسے تعلیمی نظام کو تشکیل دینا ہے جس سے ہندوستان کے تمام بچوں کو یکساں فائدہ ہو اور کوئی بھی بچہ علم کی دولت کے حصول سے محروم نہ رہ جائے۔ ایک جامع اور مساوی نظامِ تعلیم ہو اور سبھی بچوں کو مساوی اکتساب و آموزش کے مواقع میسر ہوں تاکہ ۲۰۳۰ تک تمام طبقات اور معاشرہ کے تمام افراد تعلیم میں برابر ہو جائیں۔ اس کے لیے ملک بھر کے پسماندہ علاقوں میں خصوصی تعلیمی زون قائم کئے جائیں گے۔ ریاستوں کو ترغیب دی جائے گی کہ وہ ان زونوں کو معاشرتی ترقی اور معاشی و سماجی مظاہر پر مبنی بنائیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتیں ۲:۱ کے تناسب سے مالی مدد فراہم کریں گی اور دونوں کی مشترکہ نگرانی ہوگی۔ اسکولوں کے اساتذہ اور طلباء میں صنفی عدمِ توازن کو دور کرنے کے لئے خواتین کی حصہ داری اور لڑکیوں کی تعلیم، قبائلی، ذات پات اور مذہب پر مبنی گروہوں کی تعلیم کو یقینی بنایا جائے گا تاکہ ان اقوام و طبقات کے بچوں کو ان کے لئے مختص تمام فوائد حاصل ہوں۔ شہری غریب خاندانوں کے بچوں اور مخصوص ضروریات والے بچوں کو ان

www.urduacademyts.com

کے پڑوس کے اسکولوں میں مرکزی دھارے کے بچوں کے ساتھ بنیادی تعلیم سے بارہویں درجہ تک کی تعلیم دی جائے گی۔

اسکول کا نظم ونسق: ایک بڑے احاطہ میں کئی اسکولوں (۱۰-۲۰ سرکاری اسکولوں) کو منظم کیا جائے گا اور یہ انتظامیہ ونظم وضبط کی بنیادی اکائی ہوگی جو تمام وسائل کی فراہمی کو یقینی بنائے گی۔ اسکولوں کے احاطے کے قیام سے وسائل کے بحران کو کم کرنے اور موثر انتظامی یونٹ بنانے میں مدد ملے گی۔ ریاستی حکومتیں ۲۰۲۳ تک آبادی کی تقسیم، ذرائع اتصال اور علاقائی ضرورتوں کے اعتبار سے اسکولوں کو مختلف احاطے میں تقسیم کریں گی۔ ایک احاطہ میں ۱۰-۲۰ اسکولوں کا ایک گروپ ہوگا جہاں درجہ اول سے بارہویں کلاس تک کی تعلیم فراہم کی جائے گی۔ اسکولوں کو احاطوں میں گروپ بندی سے اسکولوں کے وسائل کی شراکت وحصہ داری میں تمام مضامین کے قابل اساتذہ، کھیل، موسیقی اور آرٹ کے اساتذہ، مشیران اور سماجی کارکن شامل ہوں گے۔ اس میں مادّی وسائل جیسے لیباریٹری، لائبری، آئی سی ٹی کے آلات، کھیلوں کے سازوسامان، کھیلوں کے شعبوں وغیرہ کی منظم اہتمام ہوگا جس کے نتیجے میں عوامی وسائل کی سہولیات کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوگا۔ ہر ایک کمپلیکس کے لئے اساتذہ کی جامع ترقی کا منصوبہ تیار کیا جائے گا، ہفتہ وارانہ میٹنگ، اساتذہ کے آموزش کے مراکز تیار کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ مسلسل پیشہ ورانہ ترقی کی غرض سے سمینار، طبقاتی تربیت، نمائش وغیرہ کا اہتمام کیا جائے گا۔ تعلیم وتربیت کے ضلعی انسٹی ٹیوٹ، بلاک اور کلسٹر میں واقع مراکز سمیت تعلیم اور اساتذہ کے تعاون کا نظام اسکولی کمپلیکس اور احاطہ کے نظام سے منسلک ہوگا۔ اس میں ایک اسکول کمپلیکس انتظامیہ کمیٹی ہوگی جو کمپلیکس کے تمام اسکولوں کے نمائندوں اور دیگر اداروں جن میں بالغوں کی تعلیمی مرکز، کلسٹر ریسورس سینٹر کے نمائندے شامل ہوں گے۔ اس کمیٹی کو با اختیار بنایا جائے گا تاکہ وہ ریاست اور اس کے اداروں کے ساتھ اسکول کی جانب سے مداخلت کے لئے آواز اٹھائیں اور یہ کمیٹی اساتذہ کی کارکردگی کے انتظام میں بھی مرکزی کردار ادا کرے گی۔ ہر ضلع میں ایک ضلع تعلیمی کونسل یا ضلع تعلیم پریشد بھی ہوگا۔

اسکولی تعلیم کے ضوابط: ہندوستان کے اسکولوں کی تعلیمی نظام کو موثر ضابطہ اخلاق اور معیار کی تصدیق (accreditation) کے لائحہ عمل سے تقویت ملی ہے جو سالمیت اور شفافیت کو یقینی بناتے ہیں اور تعلیمی نتائج کو مستقل طور پر بہتر بنانے کے لئے معیار اور جدّت کو فروغ دیتے ہیں۔ مفادات کے تنازعات کو ختم کرنے کے لئے اسکولوں کے ضابطے اور قوانین الگ الگ اداروں کے اعتبار سے بنائے جائیں گے۔ پالیسی سازی، ضوابط وقوانین، سرگرمیاں وتعلیمی امور کے لیے ایک واضح اور علاحدہ نظام ہوگا۔ ریاستی اسکول ریگولیٹری اتھارٹی کے نام سے ایک ریاستی وسیع ریگولیٹری ادارہ جسے ہر ریاست کے لئے نیم عدلی حیثیت سے تشکیل دیا جائے گا جبکہ پوری ریاست کے پبلک اسکولی

www.urduacademyts.com

نظام کے عمل کو ڈائریکٹوریٹ آف اسکول ایجوکیشن سنبھالے گا۔اصول وضوابط کی بنیاد اسکول کے معیار کی تشخیص اور معیار کی تصدیق کے نظام پر ہوگی۔فریم ورک صرف بنیادی معیار کے مسائل کو حل کرے گا جب کہ اسکول خود معیار کی تصدیق کرے گا اور آڈٹ کا ایک طریقہ کار وضع کرے گا جس کا اطلاق سرکاری اور نجی دونوں اسکولوں پر ہوگا۔ریاست میں معیار کی تعیین اور نصاب سمیت تمام تعلیمی معاملات کی سربراہی ریاستی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت(SCERT) کرے گی۔اسکول چھوڑنے کے مرحلے میں طلباء کی اہلیت کی سند کی فراہمی کا کام ریاست میں سرٹیفیکشن امتحان بورڈ سنبھالے گا جو اس مقصد کے لئے معنی خیز امتحانات کا انعقاد کرے گا، تاہم نصاب (طے شدہ کتب سمیت) کے تعین میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوگا۔ریاستی کونسل برائے تعلیمی تحقیق وتربیت ہر ریاست کے لئے اسکول کے معیار کی تشخیص اور معیار کی تصدیق کا فریم ورک تیار کرے گی اور اس کا استعمال ریاستی اسکول ریگولیٹری اتھارٹی اپنے اسکولوں کو باقاعدگی کے نظام پر مبنی ریگولیٹری کے لئے کرے گی۔قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیق وتربیت کے ذریعہ کی جانے والی طلباء کی آموزش کی سطح سے متعلق قومی کامیابی سروے (National Achievement Survey) اور مردم شماری پر مبنی تشخیص سروے بھی جاری رہے گا۔تعلیمی حق کے ایکٹ(RTE Act) کا تجزیہ کیا جائے گا اور اس پالیسی کو قابلِ عمل بنانے کے لئے اگر ضرورت ہو تو مناسب ترمیم کی جائے گی۔

تعلیمِ بالغان: اس تعلیم کا مقصد ۲۰۳۰ تک صد فیصد نوجوانوں اور بالغوں کی خواندگی حاصل کرنا ہے۔خواندگی اور بنیادی تعلیم افراد کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ زندگی بھر آموزش کے مواقع میں حصہ لے سکے۔تعلیم ہر شہری کا بنیادی حق ہے لیکن ہمارے نوجوانوں اور بالغوں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اب بھی ناخواندہ ہے۔بالغوں کی تعلیم کے لئے قومی نصاب کا ایک فریم ورک تیار کیا جائے گا جو پانچ وسیع شعبوں یعنی بنیادی خواندگی اور اعداد، زندگی کی تنقیدی صلاحیتوں ، پیشہ ورانہ مہارتوں ، بنیادی تعلیم اور مسلسل تعلیم پر محیط تیار کیا جائے گا۔ اس فریم ورک کے حساب سے درسی کتب، آموزش کے سامان، تشخیص اور سند تیار کئے جائیں گے۔ بالغوں کی تعلیمی مراکز کے منتظمین اور اساتذہ (Instructors) نیز 'ایک کی تدریس ایک کے لئے' (one-on-one tutors) کی ایک بڑی ٹیم قومی بالغ تعلیم مدرسین پروگرام (National Adult Education Tutors Programme) کے ذریعہ بنائی جائے گی اور اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ بالغوں کو تعلیم دے سکے۔موجودہ طریقوں اور پروگراموں کا فائدہ اٹھایا جائے گا اور معاشرہ سے شرکاء کی شناخت کے لئے رضاکاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔معاشرہ کے ہر تعلیم یافتہ شخص کو کم ازکم ایک ناخواندہ فرد کو تعلیم دینے کی حکمتِ عملی ہوگی اور خواتین کی تعلیم پر خصوصاً زور ہوگا۔

www.urduacademyts.com

خاتمہ: اس پالیسی کو موجودہ وقت اور حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں کو مدّ نظر رکھ کر بڑی حکمت اور دوررسی سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ پالیسی موجودہ ہندوستانی تعلیم کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ اس پالیسی کو اگر صد فیصد عمل میں لایا گیا پھر اس ملک کی تقریباً تمام تعلیمی پریشانیاں دور ہوسکتی ہیں۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانا ناممکن تو نہیں لیکن بہت ہی مشکل امر ہے اور ہندوستانِ ماضی اس بات کی گواہ ہے کی اچھی اچھی پالیسیاں بنیں لیکن اس کو صحیح طریقے سے زمیں پر اتارا نہ جاسکا۔ اس پالیسی میں متعدد اداروں کی سربراہی میں کلیدی اقدامات کی نشاندہی کی گئی ہے تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ تعلیم میں شامل تمام اداروں میں منصوبہ بندی اور ہم آہنگی کے ذریعہ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ موبیئس کی پٹی کا نظارہ علم کی دوامی، نشونما اور رواں فطرت کی علامت ہے جو مسلسل ہے یعنی اس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔ اس پایسی میں اس تسلسل کے ایک حصے کے طور پر علم کی تحقیق، ترسیل، استعمال اور پھیلاؤ کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ بنی نوع انسان کے ہر دور میں علم اس مجموعے کی نمائندگی کرتا ہے جو پچھلی نسلوں نے تخلیق کی ہیں جس میں موجودہ نسل اپنا اضافہ کرتی ہے۔

☆☆☆

اسسٹنٹ پروفیسر
کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، دربھنگہ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ماہ صیام: بخشش اور مغفرت کا مہینہ

جب شیاطین جکڑ لئے جاتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطان اور اور سرکش جن قید کر لیے جاتے ہیں۔ دوزخ کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں۔ اس کا کوئی دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ آواز دینے والا پکارتا ہے اے خیر کے طلب کرنے والے متوجہ ہوں۔ ایسا اعلان ہر رات ہوتا ہے۔

بخشش اور مغفرت کا مہینہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس نے ایمان اور احتساب کے احساس کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کردیے جائیں گے اور جس نے ایمان اور احتساب کے احساس کے ساتھ قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف کردیے جائیں گے اور جس نے لیلتہ القدر کی رات ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام کیا اس کے سارے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

روزہ اور قرآن مجید شفاعت کریں گے:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''روزے اور قرآن دونوں بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزے کہیں گے کہ اے رب بے شک میں نے اس کو کھانے اور شہوت سے روکا۔ اس کے بارے میں میری شفاعت قبول کر اور قرآن مجید کہے گا میں نے اس کو رات کے وقت سونے سے روکے رکھا تو اس کے معاملے میں میری شفاعت قبول کر۔ چنانچہ دونوں اس کی شفاعت کریں گے۔

روزہ دار کے لیے جنت کے دروازے کا نام:

حضرت سہل ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ ان میں سے ایک دروازے کا نام باب الریان ہے جس میں سے صرف روزے دار داخل ہوں گے۔

کوکب شہزاد: اردو پوائنٹ

اشاعت: 16 جون 2015

www.urduacademyts.com

مومن سمیہ

طلبہ میں خود توقیری، تعلیمی تحصیل اور سوشل میڈیا کا استعمال

اکیسویں صدی میں، جسے ڈیجیٹل دور (Digital Age) کہا جاتا ہے، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے انسانی زندگی میں بلا شک وشبہ ایک مرکزی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعہ معلومات کی آسانی سے اور کم قیمت کے علاوہ تیز رفتار رسائی اور مواصلاتی نیٹ ورک (Communication Network) کی توسیع (Expansion) نے افراد کو سوشل میڈیا کے استعمال کی طرف راغب کیا ہے۔ دورِ حاضر میں چاروں طرف معلومات کا سمندر ہے اور یہ معلومات صرف ایک بٹن کی دوری پر ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں سوشل میڈیا نے حیرت ناک طور پر اور تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اور دنیا بھر کے لاکھوں صارفین کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

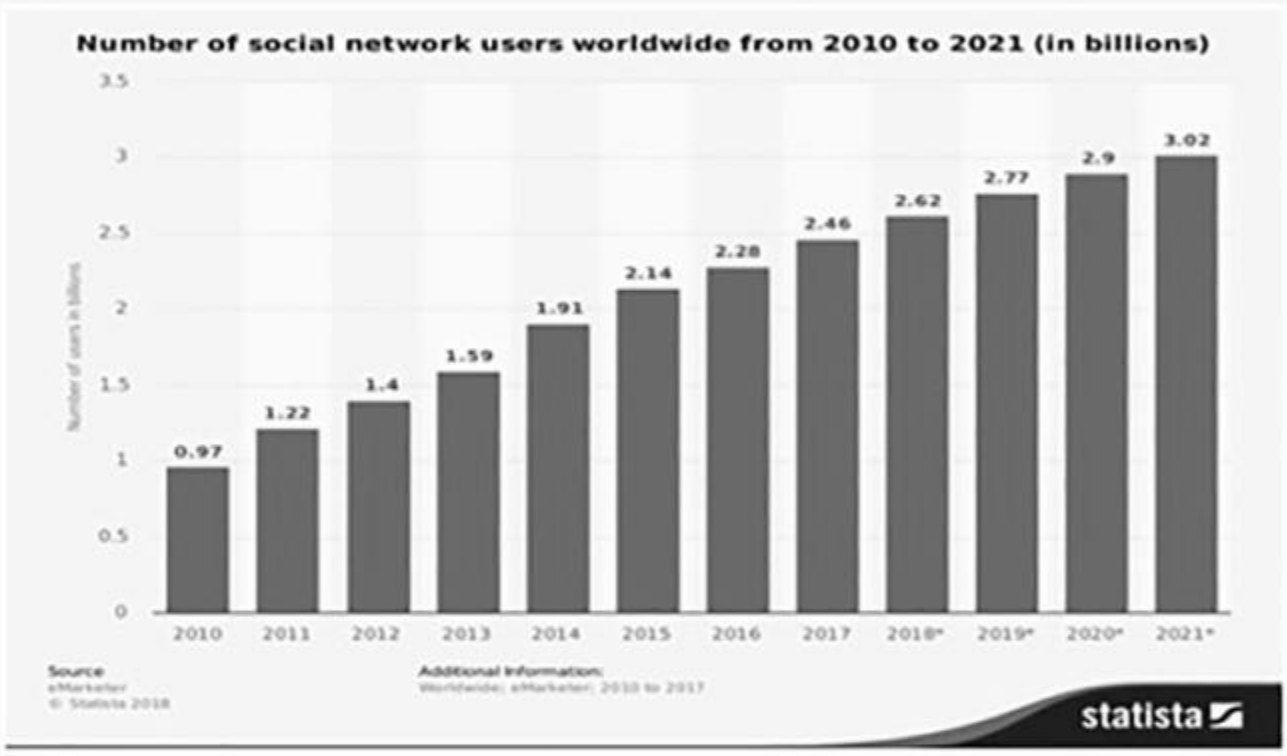

Source: https://bit.ly/3hd9F53

سوشل میڈیا ویب پر مبنی ایک ٹیکنالوجی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑنے، اپنے خیالات اور معلومات کے تبادلے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ حالیہ برسوں میں افراد کے درمیان سوشل میڈیا، سماجی ربط وترسیل کا بھی ایک بہت بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات اور خیالات کے اظہار کا بھی موقع فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پیغام بھیجنے، تصاویر کو شیئر کرنے، آڈیو اور ویڈیو کالس کرنے اور پوری دنیا سے منسلک ہونے جیسی سہولتیں بھی فراہم کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ عوامی زندگی کا ایک اہم اور لازمی جز بن گیا ہے۔ جسمانی (Physically) طور پر ایک دوسرے سے دور ہونے کے باوجود دنیا کی تقریباً آدھی سے زیادہ آبادی سوشل میڈیا کے ذریعے جڑی ہوئی ہے اور لوگ باہم استفادہ کر رہے ہیں۔ دور دراز کے علاقوں میں مقیم افرادِ خاندان، رشتے دار اور دوست واحباب کے درمیان دوری کی دیوار کو ختم کر کے سوشل میڈیا نے کم سے کم اخراجات میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

Merriam Webster Dictionary کے مطابق سوشل میڈیا الیکٹرانک کمیونٹی کی ایک شکل ہے جس کے ذریعے صارفین آن لائن کمیونٹی بناتے ہیں تا کہ وہ اپنے خیالات واحساسات، معلومات، ذاتی پیغامات اور دیگر مواد (آڈیو اور ویڈیو) لوگوں سے شیئر کر سکیں۔

(Forms of electronic communities (as web sites for social networking &

www.urduacademyts.com

micro-blogging) through which users create online communities to share information, ideas, personal massage and other content (video & audio).

Boyd and Ellison (2007) نے سوشل میڈیا کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ ویب پر مبنی ایک عوامی خدمت ہے جو صارفین کو ذاتی پروفائل بنانے، دیگر صارفین کے ساتھ ربط و ترسیل کے لئے ان کی شناخت کرنے، سائٹ پر موجود دیگر صارفین کی پوسٹس (Posts) کو پڑھنے اور ان پر ردِ عمل ظاہر کرنے، اور نجی یا عوامی طور پر پیغامات کو بھیجنے یا وصول کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

(A public web-based service that allows users to create a personal profile, identify other users with whom they'll relate to or have a connection with, read and react to posts made by other users on the site, and send and receive messages either privately or publicly.)

دسمبر 1995 میں شروع ہوئی سِکس ڈگری ڈاٹ کام (SixDegrees.com) سوشل میڈیا کی ابتدائی سائٹ میں سے ایک ہے جس نے صارفین کو پروفائل اپ لوڈ کرنے اور دیگر صارفین کے ساتھ دوستی کرنے کا موقع فراہم کیا۔ سی بی ایس نیوز CBS News کے مطابق، سِکس ڈگری کو بڑے پیمانے پر پہلے سماجی رابطوں کی سائٹ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس میں پروفائلز، دوستوں کی فہرستیں وغیرہ شامل تھیں جو درج صارفین (Registered Users) استعمال کر سکتے تھے۔

Source: https://bit.ly/3CF2FpQ

ہندوستان نے دونوں بانہیں کھول کر سوشل میڈیا کو قبول ہے۔ گوگل، فیس بک اور ٹویٹر جیسی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کروڑوں ہندوستانیوں کی روزمرہ زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گئی ہے۔ فروری 2021 میں India Today میگزین میں طبع شدہ آرٹیکل کے مطابق مرکزی وزیر روی شنکر پرساد نے انکشاف کیا ہے کہ واٹس ایپ (WhatsApp) ہندوستان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی اپیلی کیشن ہے۔ واٹس ایپ کے بعد دوسرے نمبر پر یوٹیوب (Tube You) ہے، اس کے بعد فیس بک (Book Face)،

www.urduacademyts.com

انسٹاگرام (Instagram) اور ٹویٹر (Twitter) شامل ہیں۔ انہوں نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ہندوستان میں واٹس ایپ کے 53 کروڑ سے زیادہ صارفین ہیں، اس کے بعد یوٹیوب ہے جس کے 44.8 کروڑ سے زیادہ صارفین ہیں۔ فیس بک کے پاس لگ بھگ 41 کروڑ، انسٹاگرام کے 21 کروڑ صارفین ہیں۔ تخمینے بتاتے ہیں کہ 2023 تک، ملک میں تقریباً 450 ملین سوشل نیٹ ورک صارفین ہوں گے، جو 2018 میں 326 ملین سے بھی کم تھے۔

نوجوانوں خاص کر طلبا کے درمیان سوشل میڈیا کے استعمال میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے جس کا اثر ان کی روزمرہ کی زندگی پر بھی ہو رہا ہے اور وہ اس کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کے استعمال نے طلبا کی زندگی پر مثبت اثرات مرتب کیے ہیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ منفی اثرات بھی مرتب ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ منفی اثرات نہ صرف ان کی پڑھائی (اسٹڈی) بلکہ صحت پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ چونکہ دورِ حاضر میں انٹرنیٹ کی مفت یا کم پیسوں میں دستیابی کی وجہ سے صارفین کے درمیان سوشل میڈیا کے استعمال میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا ہے جس سے ان کے درمیان سوشل میڈیا کے استعمال کی لت کے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ سابقہ مطالعات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ نوجوان افراد اور طلبا سوشل میڈیا کا سب سے زیادہ استعمال اپنی پڑھائی اور تفریح و لطف اندوزی کے لئے کرتے ہیں۔ لیکن سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے استعمال کے لئے زیادہ وقت صرف کرنے کی وجہ سے کچھ محققین اس دلیل پر مجبور ہوئے ہیں کہ زیادہ استعمال سے افراد اور طلبا اس کے منفی اثرات کا شکار ہو رہے ہیں۔

خودتوقیری (Self Esteem):

خودتوقیری، خوداعتمادی (ذاتی صلاحیت کا احساس) اور عزت نفس کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یعنی کہ ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ صلاحیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس قابل بن جاتا ہے کہ زندگی کے چیلنجوں کا سامنا کر سکے اور مسائل کو حل کر سکے۔ خودتوقیری ایک ایسی اصطلاح ہے جو نفسیات میں استعمال ہوتی ہے تاکہ ہر فرد اپنی اقدار کی مجموعی جذباتی تشخیص کی عکاسی کر سکے۔ یعنی کہ وہ اپنے بارے میں سوچتا ہے یا اپنے آپ کو پسند کرتا ہے اور اپنی کارکردگی سے خوش اور مطمئن ہوتا ہے۔ خودتوقیری کو وسیع پیمانے پر مثبت یا منفی انداز میں خود کے مجموعی فیصلے کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک فرد کس حد تک اپنے آپ کو خود کے ہی قابل اور لائق و فائق سمجھتا ہے۔

خود اعتمادی (Self Confidence) میں یقیناً اعتماد شامل ہوتا ہے جب کہ خودتوقیری میں خود کی اہمیت کا احساس (Self-Worth)، خود کا احترام (Self-Regard)، عزتِ نفس (Self-Respect) اور خودمختاری (Self-Integrity) وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ خودتوقیری، شخصیت کا ایک بہت اہم پہلو ہے۔ اسے عام طور پر ایک فرد کی خصوصیت کے طور پر سمجھا جاتا ہے جو اس کی مجموعی قدر اور خود کی اہمیت کے احساس کو ظاہر کرتی ہے۔ اعلیٰ یا مثبت خودتوقیری ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ خود پر فخر کرنا سکھاتا ہے اور کتنے بھی برے حالات کیوں نہ ہوں یہ ہمارے اندر حوصلہ اور یقین جیسی طاقت کو پیدا کرتا ہے۔

تعلیمی تحصیل (Academic Achievement):

تعلیمی تحصیل دراصل ایک اصطلاح ہے جو طلبا کی تعلیمی کامیابی کی سطح کے تعین کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کامیابی میں کسی ایک مضمون یا سبھی مضامین سے متعلق وہ تمام سرگرمیاں شامل ہوتی ہیں جو طلبا اسکول یا کالج میں مکمل کرتا ہے۔ یہ تعلیمی نظام میں طلبا کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے۔

تعلیمی تحصیل، دراصل کسی خاص مضمون کی تفہیم، معلومات اور مہارت کے حصولیابی کی سطح ہے جسے عام طور پر اساتذہ ٹیسٹ یا امتحان

www.urduacademyts.com

کے مارکس یا اسکور کے شکل میں ظاہر کرتے ہیں ڈکشنری آف ایجوکیشن (Carter, 1959) کے مطابق "تعلیمی تحصیل کے معنیٰ کچھ اس طرح ہے کہ اسکولی مضامین میں حاصل کردہ معلومات اور مہارتوں کا فروغ ہے، جسے اساتذہ کے ذریعے عام طور پر پرٹیسٹ کے اسکور یا مارکس یا دونوں کے ذریعے تفویض کیا جاتا ہے۔"

(The knowledge attained or skills developed in the school subjects, usually determined by test scores or by the marks assigned by teacher for both.)

Wikipedia پر تعلیمی تحصیل کے بارے میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ "تعلیمی تحصیل یا تبلیغ کارکردگی وہ حد ہوتی ہے، جہاں پر طلباء، اساتذہ یا ادارے کی مختصر یا طویل مدتی تعلیمی اہداف کی حصولیابی ہوتی ہے۔

(Academic Achievement or Academic Performance is the extent to which a student, teacher or institution has attained their short or long-term educational goals.)

طریقہ تحقیق:

موجودہ مطالعے کے ذریعے محقق نے طلبا کی خودتوقیری، تعلیمی تحصیل اور سوشل میڈیا کے استعمال کے مابین ہم رشتگی جاننے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی مذکورہ متغیرات میں صنف کے لحاظ سے فرق کو بھی جاننے کی کوشش کی ہے۔ ان مقاصد کی حصولیابی کے لئے 120 پوسٹ گریجویشن کے طلبا کو بطور نمونہ منتخب کیا گیا اور معطیات جمع کرنے کے لئے خود کا تیار کردہ آلہ 'Social Media Usage Scale' اور ایک معیاری آلہ 'Rosenberg Self-Esteem Scale' کا استعمال کیا گیا۔ تعلیمی تحصیل کے طور پر طلبا کے پچھلے سمسٹر امتحان میں حاصل کردہ مارکس کو شامل کیا گیا ہے۔ آن لائن (گوگل فارم) کے ذریعے معطیات کو جمع کیا گیا اور اس کا تجزیہ کیا گیا۔

معطیات کا تجزیہ وتشریح:

جدول نمبر۔1۔ متغیرات میں صنف کے لحاظ سے فرق

متغیرات	گروپ	طلبا کی تعداد	اوسط	معیاری انحراف	't' قدر	ریمارکس
سوشل میڈیا کا استعمال	طلبہ	60	52.22	4.809	1.968	اہم (Significant)
	طالبات	60	54.43	7.282		
خودتوقیری	طلبہ	60	22.13	4.485	0.955	غیر اہم (SignificantNot)
	طالبات	60	21.38	4.109		
تعلیمی تحصیل	طلبہ	60	74.19	5.435	3.921	اہم (Significant)
	طالبات	60	70.39	5.178		

www.urduacademyts.com

جدول نمبر 1 میں طلبہ و طالبات کے سوشل میڈیا کے استعمال، خودتوقیری اور تعلیمی تحصیل کے تقابل کو شماریاتی تکنیک کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ جدول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

☆ طلبہ کا سوشل میڈیا کے استعمال کا اوسط اسکور (mean)52.22 اور طالبات کا سوشل میڈیا کے استعمال کا اوسط اسکور 54.43 ہے۔ ان کے t-test کی قدر (value)1.968 ہے جو کہ 0.05 اور 0.01 دونوں سطحوں پر معنیٰ خیز (significant) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوشل میڈیا کے استعمال میں صنف کی بنا پر معنی خیز فرق ہے۔ اوسط کے اعتبار سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ طلبہ کے مقابلے طالبات کے درمیان سوشل میڈیا کا استعمال زیادہ ہے۔

☆ طلبہ کی خودتوقیری کا اوسط اسکور (mean)22.13 اور طالبات کی خودتوقیری کا اوسط اسکور 21.38 ہے۔ ان کے t-test کی قدر (value)0.955 ہے جو کہ 0.05 اور 0.01 دونوں سطحوں پر معنیٰ خیز نہیں (not significan) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودتوقیری میں صنف کی بنا پر معنی خیز فرق نہیں ہے۔

☆ طلبہ کی تعلیمی تحصیل کا اوسط اسکور (mean)74.19 اور طالبات کی تعلیمی تحصیل کا اوسط اسکور 70.39 ہے۔ ان کے t-test کی قدر (value)3.921 ہے جو کہ 0.05 اور 0.01 دونوں سطحوں پر معنیٰ خیز (significant) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صنف کے لحاظ سے طلبا کی تعلیمی تحصیل کے درمیان معنی خیز فرق ہے۔ اوسط کے اعتبار سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ طالبات کی تعلیمی تحصیل، طلبہ کے مقابلے میں کم ہے۔

جدول نمبر۔2۔ متغیرات کے مابین ہم رشتگی

متغیرات	سوشل میڈیا کا استعمال	خودتوقیری	تعلیمی تحصیل
سوشل میڈیا کا استعمال	1	-0.480**	-0.463**
خودتوقیری	-0.480**	1	0.209*
تعلیمی تحصیل	-0.463**	0.209*	1

Tabulated 'r' value (two-tailed) for df = 120

0.05 level = 0.175*

0.01 level = 0.228**

جدول نمبر 2 میں طلبا کے سوشل میڈیا کے استعمال، خودتوقیری اور تعلیمی تحصیل کے درمیان ہم رشتگی کو دکھایا گیا ہے۔

☆ سوشل میڈیا کے استعمال اور خودتوقیری کے مابین ہم رشتگی کی شرح '0.480-' ہے جو کہ منفی (negative)، معتدل (moderate) اور معنیٰ خیز (Significant) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبا کے مابین سوشل میڈیا کے زیادہ استعمال سے ان کی خودتوقیری میں کمی ہو رہی ہے۔ یعنی سوشل میڈیا کا زیادہ استعمال، طلبا کی خودتوقیری پر منفی اثر مرتب کر رہا ہے۔

☆ سوشل میڈیا کے استعمال اور تعلیمی تحصیل کے مابین ہم رشتگی کی شرح '0.463-' ہے جو کہ منفی (negative)، معتدل (moderate) اور معنیٰ خیز (Significant) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبا کے مابین سوشل میڈیا کے بڑھتے استعمال سے ان کی تعلیمی تحصیل میں کمی ہو رہی ہے۔ یعنی سوشل میڈیا کے زیادہ استعمال سے طلبا کی تعلیمی تحصیل پر منفی اثر ہو رہا ہے۔

www.urduacademyts.com

☆ خود توقیری اور تعلیمی تحصیل کے مابین ہم رشتگی کی شرح '0.209' ہے جو کہ مثبت (positive)، ادنیٰ (low) لیکن معنیٰ خیز (Significant) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبا کے مابین اعلیٰ اور مثبت خودتوقیری کی وجہ سے ان کی تعلیمی تحصیل بھی مثبت طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔

محاصلات اور نتائج:

☆ مندرجہ بالا مطالعے میں طلبا کے مابین سوشل میڈیا کے استعمال اور خودتوقیری کے درمیان منفی ہم رشتگی پائی گئی ہے۔ اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سوشل میڈیا کے زیادہ استعمال سے ان کی خودتوقیری بھی متاثر ہورہی ہے۔ طلبا کے لئے اعلیٰ اور مثبت خودتوقیری بے حد ضروری ہے کیونکہ یہ نہ صرف ان میں خوداعتمادی اور عزتِ نفس پیدا کرتی ہے بلکہ ان میں خودمختاری کا بھی جذبہ پیدا کرتی ہے جو ان کی آگے کی تعلیمی زندگی اور ذاتی زندگی دونوں میں صحیح فیصلہ کرنے میں مدد کرتا ہے۔

☆ سوشل میڈیا کے استعمال اور تعلیمی تحصیل کے درمیان منفی ہم رشتگی پائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوشل میڈیا کے استعمال میں اضافہ ہونے کی وجہ سے طلبا کی تعلیمی تحصیل میں کم ہوتی جارہی ہے۔ سوشل میڈیا کو اعلیٰ تعلیم میں ایک مؤثر ذرائع کے طور پر استعمال کرنے کے لئے اسے مناسب وموزوں طریقے سے استعمال کرنا چاہئے۔

☆ مزید یہ کہ، خودتوقیری اور تعلیمی تحصیل کے مابین مثبت ہم رشتگی پائی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیمی تحصیل، مثبت اور اعلیٰ خودتوقیری کے ساتھ بڑھتی ہے۔ لہٰذا یہاں پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ خودتوقیری، تعلیمی تحصیل میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ مثبت اور اعلیٰ خودتوقیری رکھنے والا شخص اپنی تعلمت میں ادنیٰ خودتوقیری رکھنے والے شخص کے مقابلے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

سفارشات:

☆ والدین کو اپنے بچوں پر نظر رکھنا چاہئے۔ بچوں پر سوشل میڈیا کی سائٹس کے اثرات کا مشاہدہ کرتے رہنا چاہے اور ان سائٹس کے استعمال کے وقت کو محدود کرنا چاہئے۔

☆ بچوں اور طلبا کو ورکشاپ اور بیداری کے پروگراموں میں لے جانا چاہیے جہاں انہیں خوداعتمادی، خودشناسی، خودمختاری اور خودتوقیری کے بارے میں رہنمائی ومشاورت حاصل ہوسکے۔

☆ تعلیمی اداروں اور والدین کی باہمی افہام وتفہیم سے، سوشل مڈیا کے بے جا استعمال سے ہونے والے منفی اثرات کے حوالے سے طلبا میں شعور بیدار کرنے کے لیے پروگرام کا انعقاد ہونا چاہیے۔

☆ طلبا سوشل میڈیا کی سائٹس کو معلومات، مواصلات اور تعلقات بنانے اور برقرار رکھنے کے لیے استعمال کریں تا کہ اس کے منفی اثرات سے بچ سکیں اور مثبت انداز میں استعمال ہوسکے۔

☆☆☆

مومن سمیہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم وتربیت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد 032 500 (تلنگانہ)

www.urduacademyts.com

ٹیکنالوجی کا حیرت انگیز سفر

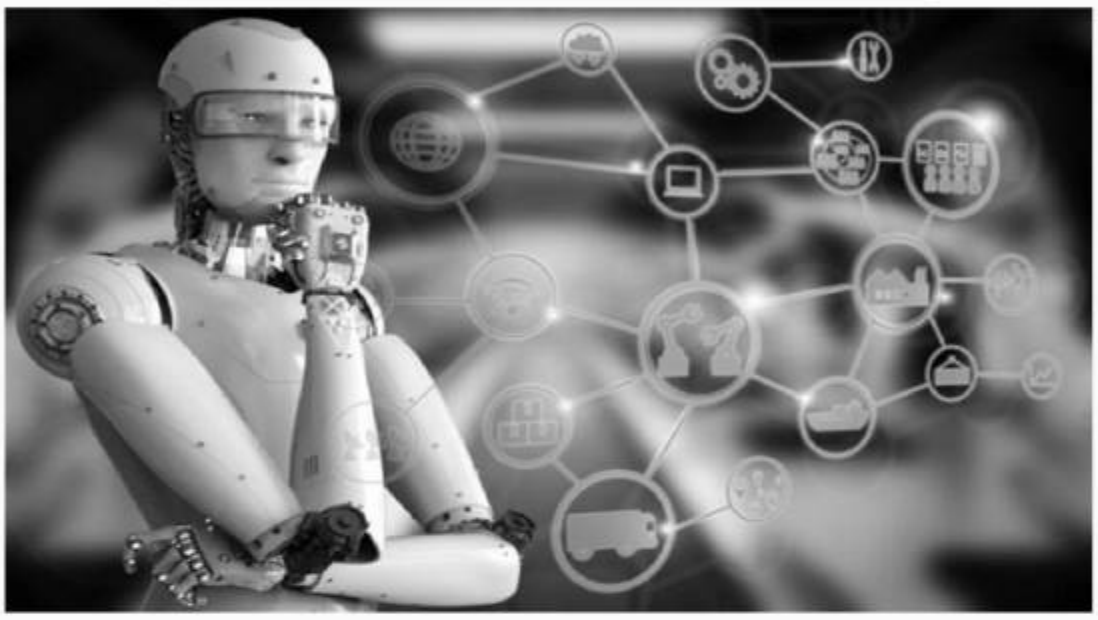

مورس لاء قانون گورٹن مورسے نے ایجاد کیا جو کہ کمپیوٹر کی کمپنی کے بانی ہیں اب سے زائد از پچاس سال پہلے انھوں نے بتایا تھا کہ کمپیوٹر کی طاقت ہر 18 ویں مہینے میں دوگنی ہو جاتی ہے اُن کا یہ نظریہ اُن Transister کی تعداد کی بنیاد پر تھا جنھیں ایک chip سے جوڑا جا سکتا تھا۔ گورڈن مورسے کا یہ قانون نیوٹن کے تیسرے قانون جیسا تھا جس کا تعلق رفتار کی پیمائش سے تھا بلکہ یہ صرف مشاہدہ تھا اس نکتہ نظر کے پیش کئے جانے سے لے کر اب تک پچاس سال سے زائد عرصہ میں یہ کافی درست ثابت ہوا کمپیوٹر کی طاقت ہر سال ایک خاص شرح سے بڑھتی ہے جس کی وجہ سے دیگر اُمور کی پیشین گوئی ممکن ہوگئی ہے وہ ایک مشہور شخصیت جس کی پیشین گوئیاں بڑی حد تک درست ثابت ہوئی ہیں رے کروزیل ہے جو ایک موجد یا ندرت کار کی حیثیت سے گوگل سے وابستہ ہیں اُن کی پیشین گوئی بالکل ویسی ہے جیسے نوسٹرے ڈیمس سے ہوا کرتی تھی اب بھی اسی لئے انھیں دور حاضر کا نوسٹرے ڈیمس کہتے ہیں کیونکہ اتنے عرصہ میں اُنھیں کافی اعتبار حاصل ہوا کہ انھوں نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ درست ثابت ہوئیں رے کروزیل نے اپنا جو پہلا خیال پیش کیا جسے پیشین گوئی کہا جا سکتا ہے اُسے ''ایج آف انٹلی جنٹ مشن'' مثنوی ذہانت کا عہد نام دیا گیا جس پر انھوں نے 1980ء میں کام شروع کیا مورسے لاء کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے مذکورہ کتاب میں پیشین گوئی کی تھی 1998ء کے آس پاس کمپیوٹر کی طاقت اس حد تک بڑھ جائے گی کہ وہ شطرنج کے کسی ماہر کھلاڑی کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس سے ایک سال قبل یعنی 1997ء میں گیری کاسپر دکو آئی بی ایم کے کمپیوٹر ''ڈیپ بلیو'' نے شکست دی تھی۔ کروزیل نے گوگل جیسے کسی سرچ انجن کی پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ 2010ء سے پہلے ہی کمپیوٹر Wifi نیٹ ورک پر چلنے لگے گا 2010ء میں انھوں نے ایک فہرست مرتب کی جس میں بتایا کہ اپنی اس کتاب میں انھوں

www.urduacademyts.com

نے کونسی پیشین گوئی کی تھی ان میں صرف تین پیشین گوئیاں ایسی تھیں جو مکمل طور پر غلط ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئندہ دس سال کے لئے انھوں نے جو پیشین گوئیاں کی ہیں وہ پوری دُنیا میں دلچسپی کا سبب بنی ہوئی ہیں اور خیال کیا جارہا ہے کہ اگر انھوں نے گذشتہ پچاس سال میں بیشتر پیشین گوئیاں بالکل درست کی ہیں تو کیوں نہ آئندہ سال کی پیشین گوئیوں پر بھروسہ کیا جائے یہ ساری باتیں کمپیوٹر کی روز افزوں طاقت کی بنیاد پر کہی جارہی ہیں وہ سائنس داں اپنے کمرے میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو بہتر سمجھتے ہوئے اس مشین کے آئندہ کی طاقت کی پیمائش کر رہے ہیں آج سے تیس سال پہلے ہم ٹیچ اسکرین موبائل کا استعمال کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے تھے کہ ایک دور آئے گا جب اسمارٹ فون بڑی آسانی سے اور ارزاں قیمت پر حاصل ہوگا۔ رے کروزیل کی خوبی یہ ہے کہ وہ ٹیکنالوجی کے بہتر تجزیہ کے ذریعے اس کی طاقت کو سمجھنے اور اس کی رفتار، ترقی کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہے ان کا کہنا ہے کہ آئندہ دس برس میں اگر تمام نہیں تو بیشتر امراض قابل علاج ہوجائیں گے اس طرح ممکن ہوگا کہ ایسے Nano Bots ایجاد ہوں گے جو مریض کے خون میں داخل ہوکر مرض کی تشخیص کر لینگے۔ Nano Bots کا مطلب یہ ہے کہ معمولی جسامت کا روبوٹ، طبی سہولتوں کی فراوانی کی وجہ سے انسان کی اوسط عمر میں اضافہ ہوا ہے ہندوستانیوں کی اوسط عمر چالیس سے ستر سال کے آس پاس تک پہنچی ہے۔ مختلف امراض سے لڑنے کی سائنس کی ڈرامائی صلاحیت و اہلیت کی وجہ سے اوسط عمر میں اب مزید تیس سال کا اضافہ ہوسکتا ہے ایسے میں ملازمت سے سبکدوشی کی عمر کا نئے سرے سے تعین کرنا گزیر ہوجائے گا۔

رے کروزیل کا یہ کہنا ہے کہ آئندہ پندرہ سال میں مصنوعی ذہانت اور حقیقی یا فطری تقریباً ختم ہوجائے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ مشین دیکھنے، مس کرنے، سونگھنے اور سننے کی ویسی ہی صلاحیت کی حامل ہو جائے گی جیسا کہ ہماری صلاحیت ہے۔ بہت سے لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی طاقت اور صلاحیت کے تاریک پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے ہیں مگر شاید ہی کوئی ہو جسے مسلسل اضافہ سے ہمکنار ہونے والی اس طاقت پر شبہ ہو اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا کہ فی الحال ہم بھی نصف انسان اور نصف مشین روبوٹ ہیں ایسی شخصیت کو Cyborg نام دیا گیا ہے ہمارا موبائل فون ہماری شخصیت کی توسیع ہے جس کے ذریعے ہم دُنیا کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے قابل ہوگئے ہیں ہم جی پی ایس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں ہم میں سے کتنے لوگوں نے جو 1990 کی دہائی میں تھے یہ قیاس کیا ہوگا کہ ایسا دور آئے گا اور ہم مشینوں کے عادی ہوجائیں گے ٹیکنالوجی کے اس حیرت انگیز اور تیز رفتار سفر کی وجہ سے مستقبل میں وہ تمام لوگ جو محنتی ہیں زیادہ کام کرسکیں گے بلکہ ایک کمپنی کے برابر کا کام ہم سے ممکن ہوسکیں گے اور ایسے لوگ کافی فائدے میں ہوں گے اور اُن کی زندگی کافی پُرلطف ہوجائے گی۔

☆☆☆

عزیز احمد ہاشمی
روشن خان کارنر، پربھنی۔ مہاراشٹرا

www.urduacademyts.com

ابابیل

اس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامولہار کے بچے نے اس کے بیل کی دم میں کانٹے باندھ دیئے تھے تو مارتے مارتے اس کو ادھ موا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کمبخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہہ دیا، ''ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے۔'' بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیئے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا، ''کیوں بے 'نتھو' تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورے کرے گا۔ اور ابے چھدو تیری بھی شامت آئی ہے کیا۔'' اور پھر ان غریبوں کی شامت آ ہی جاتی۔ سوت کی رسی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک ہے، بیوی کو ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اس کو الٹا لٹکا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں، اس کے بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ سال کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا۔ اس نے اپنے پاس رکھ

www.urduacademyts.com

لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا، ''بلاس پور کی طرف جاؤ ذرا نورو کو لیتے آنا۔'' بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہوگیا۔ ''میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔''

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اتارنے کے لئے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا۔ اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لئے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لئے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لئے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلاف معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولھے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دوہ کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا۔ ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے۔ اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لئے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل اپنی چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

''اری، آنکھ پھوڑے گی'' اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا۔ اور گھڑونچی پر سے اتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔ اگلے دن سے اس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب بھی کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا۔ لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آ جاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں

افسانہ

www.urduacademyts.com

کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھدیئے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آرہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کبڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا۔ ''ارے میں کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں۔'' آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہانکتا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور اور بارش شروع ہوگئی۔

اندر آ کر کواڑ بند کئے اور چراغ جلا کر اجالا کیا۔ حسب معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دیئے۔ ''ارے او بندو۔ ارے او نورو'' پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیئے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کر کے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو زیلدار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ ''ارے بندو۔ ارے نورو۔ کہاں مر گئے۔ آج تمہیں کون کھانا دے گا۔'' چند ابابیلیں کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

''بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔'' کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا۔ ''صبح کو شفا خانہ والوں کو پتہ دیں گے کہ پاگل خانہ بھجوا دیں۔''

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفا خانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

خوف

اُس کے ذہن پر خوف کا بھوت چھایا ہوا تھا۔ ڈر محسوس ہوتے ہی اس کا دل دہل گیا۔ وہ دِل میں سوچنے لگا کہ کیسے خوف کا تسلط توڑا جائے۔ ابھی وہ اسی فکر میں تھا کہ خوف نے اُس کی سوچ پر ایک زہریلے سانپ کا حلیہ نقش کیا۔ اور اب جب بھی اُس کی نظر اس حلیہ پر پڑتی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ چیخ اُٹھتا۔ اسلئے کہ خوف کا یہ زہریلا سانپ بے درنگ ڈسنے لگا تھا، اُس نے اِسے فرار ہونے کی کوشش کی مگر وہ جہاں بھی جاتا، خوف کا یہ زہریلا سانپ اُس کا تعاقب کیے بنا نہیں رہتا۔ وہ پریشان ہوتا رہا۔ زہریلے سانپ سے رہائی پانا آسمان کے تارے توڑنے کے برابر تھی۔

ایک مرتبہ ایک مصور نقاش گھر کی دیوار پر مصوری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کے مریل ہاتھوں نے نہ جانے کتنی چیزوں کے دلکش حلیے بنائے تھے، کتنی باریک چیزوں کو مصوری کا حُسن دیکر قلم سے کاغذ پر اُتارا تھا۔ اور کاغذ پر اُتارنے سے پہلے دل ہی دل میں نقش کھنچا پھر کورے کاغذ پر پھیلانا اس کی کامیابی کا اصل راز تھا۔ مگر آج کی بات اور تھی، آج بورڑ پر خوف کا عکس ہو بہو اُتارنا تھا جو کوئی آسان کام نہ تھا۔ اُسے یقین تھا کہ آج وہ اس معاملے میں مصوری کی جادوگری نہ کر پائے گا۔ اور ہار یقینی ہوگئی مگر جو بھی ہو اُس نے ہمت نہ ہاری اور اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں جُڑ گیا۔ سبھی لوگ دم سادھے اُس کا مُنہ تک رہے تھے۔ مصور کے چہرے پر فکر کی کوئی پرچھائی نہ تھی۔ وہ برش انگلیوں میں تھامے ٹھیک بورڑ کے سامنے کھڑا اس منحوس عکس کو اُتارنے لگا۔

عکس اُتار کر اُس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ عکس دیکھ کر سب کی زبان سے ڈر کے مارے بیک وقت لفظ ''توبہ'' نکلا۔ آواز ابھرتے ہی لوگوں کا جمگھٹ پل بھر میں غائب ہو گیا۔ پھر بھی وہ کمرے کے ایک کونے میں پلنگڑی پر پیر لٹکائے ہتھیلی پر تھوڑی رکھے دور کی سوچ کر مطمئن تھا کہ واقعی مصّور نے آج عکس اتارنے میں فنکاری دکھائی ہے۔ اُس دن رات آتے ہی کالا نقاب پوش اُس کے گھر میں گھس آیا۔ کالر سے پکڑ کر اُس کے بھائی یوسف کو مارنے لگا۔ یوسف کی روہانسی صورت دیکھ کر اُس نے نقاب پوش کے پیر پکڑے، یوسف کو چھڑانے کے کئی منت سماجت کی۔ مگر وہ ایک نہ مانا اور کڑک کر بولا۔

''چُپ رہ! ورنہ بھائی سے پہلے تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' اُس کا جی چاہا زور سے چیخے مگر ظالم اُسے خاموش رکھنے کے لئے بندوق تانے رہا۔ یوں جان کے ڈر سے اُس پر بے بسی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

افسانہ

www.urduacademyts.com

دیکھتے ہی دیکھتے نقاش پوش یوسف کو ہانک کر باہر لے گیا۔ اگلے ہی پل سناٹے میں تڑاتڑ گولیوں کی آواز گونجی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اب یوسف کی روح آسمانوں میں چلی گئی ہے۔ سناٹے میں گونجتی گولیوں کی آواز تھی ہی جان لیوا کہ ہر طرف خاموش فضا میں دہشت سی چھا گئی۔بستی کے سارے دہشت زدہ لوگوں کی طرح وہ بھی یہ قیامت کی کالی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹنے پر مجبور ہوا۔خونخوار کالے نقاب پوش نے اُس کے ذہن پر سانپ کی طرح پھن مارا تھا اور بے بسی کے مارے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ ویسے بھی بندوق بردار جابری قوت کے سامنے بڑی سی بڑی قوت بھی بھیگی بھیگی بن جاتی ہے۔

صبح ہوتے ہی گلی کے نکڑ پر گولیوں سے چھلنی یوسف کی لاش دیکھ کر اُسے ہر چیز سلگتی دکھائی دی۔ وہ تاب نہ لاکر کپکپائے ہوئے گریہ کرنے لگا۔ اُس کے نواسے سینہ کوبی کرتے رہے،غم میں ان کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

کچھ دیر بعد لاش اُٹھائی گئی، اب وہاں خون کے دھبے کلیجی کی طرح جم کر چمک رہے تھے۔ایسا لگا تھا جیسے خون کا لوتھڑا اپنی بے گناہی کے خلاف چیخ رہا ہو۔مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا تھی۔ وہ جمے ہوئے خون کو دیکھتا رہا۔خوف کی پرچھائی اُسے پوری طرح دبوچے ہوئی تھی۔گھبرا کر گھر کی دیوار سے کچھ دیر ٹیک لگا کر سوچنے لگا کہ کیسے اس سنگ دل نقاب پوش کے ظلم سے نجات پائے۔اگلی صبح اُسے سپاہیوں کی پوچھ تاچھ اور شک شبہات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔اُسے اس بات کا ڈر ستانے لگا تھا کہ کئی سپاہی اُسے بے سبب پکڑ کر پابند سلاسل نہ کرلیں اور تھرڈ ڈگری استعمال کرکے زندگی اجیرن نہ بنادیں۔سپاہیوں کی جانب پکڑ دھکڑ جاری تھی کہ بچ نکلنا محال تھا۔ سپاہیوں کے جارحانہ برتاؤ کی وجہ سے اُس کی حالت غیر ہوتی رہی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ بے گناہی کے باوجود سپاہی اس سے تُرش برتاؤ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔اُس کا سر پانی کے بھنور کی طرح چکرا کر رہ گیا۔اُسے اُس سُنی سُنائی بات پر یقین ہوگیا کہ یہ سب پروموشن حاصل کرنے کے داؤ پیچ ہیں۔

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ آخر انسان اپنے مطلب کے لئے انسان کا دشمن کیوں ہے۔کیوں وہ بے گناہوں کا خون بہانے پر آمادہ ہے۔کیوں روپ بدل کر سنسنی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔مگر ان پیچیدہ سوالوں کا اُس سے کوئی جواب نہ بن پایا۔

اُس نے اپنے جیسے ایک پریشان حال انسان سے پوچھا! بھائی صاحب آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ وہ سر دُھنتا ہوا بولا ''انسان درندہ ہوگیا ہے، وحشی بن گیا ہے۔اس کے دل میں کدورت اور عداوت نے جگہ پالی ہے،تبھی تو ظالم بن کر زندگیوں پر قہر ڈھایا ہے۔ان

www.urduacademyts.com

مردہ ضمیروں کے دل مر چکے ہیں''۔ وہ شخص کچھ دیر بڑبڑاتے ہوئے، وہاں سے کھسک گیا۔ اُس کے کھسکتے ہی وہ بوجھل دل لئے کمرے کے اندر چلا گیا۔ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر تیز قدموں کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور دیکھا۔ باہر لوگ دوڑ رہے تھے بلکہ ناک کی سیدھ میں آگے ہی آگے بڑھے جا رہے تھے۔ اُس نے پکار کر پوچھا۔ ارے لوگو! کہاں جا رہے ہو؟ کیا بات ہے؟ پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔

قریب جا کر اُس نے ایک سے دوبارہ پوچھا!

کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟ ایک بھاگتے شخص نے رُک کر جواب دیا۔

''سُنا ہے کہ انسانی صورت کا زہریلا سانپ مار ڈالا گیا۔ اب وہ دنیا میں نہیں رہا۔ اسی لئے لوگ خوشی کے مارے اس کی لاش دیکھنے جا رہے ہیں۔''

''اچھا........! مار ڈالا گیا؟''

''ہاں مار ڈالا گیا۔''

''ارے واہ..........کس نے مار ڈالا؟''

''کسی سفید نے.....''

اُسے یقین نہ آیا، دوبارہ پوچھا!

''کیوں مار ڈالا گیا؟''

''معلوم نہیں.....شاید آپس میں ان بن ہوئی ہوگی۔''

کچھ دیر بعد لوگوں کی بھیڑ زہریلے سانپ کی لاش کو کندھوں پر اُٹھائے واپس لوٹ رہی تھی۔ آگے جا کر لاش کو ایک کُھلی جگہ پر پہلے سے رکھی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ اب تو لوگ آ آ کر لاش کے چہرے پر سے کفن اُٹھائے دیکھتے اور لوٹ جاتے تھے۔ وہ بھی آگے بڑھا' بھیڑ کو چیرتا ہوا لاش تک پہنچا۔ کفن اُٹھا کر چہرے پر نظر ڈالی اور لوٹ آیا۔ اب اس کے ذہن سے خوف کا بھوت اتر چکا تھا۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اب نہ صرف اس کے بلکہ لوگوں کے ذہنوں پر سے بھی خوف کا بھوت اُتر چکا تھا۔ شاید یہ حالات کے سنبھلنے کی نوید تھی۔ اب کنواس پر برش سے کھینچے ہوئے آڑے ترچھے بے شمار داغ معمہ بنے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر فیاض احمد ڈار
ولد جی ایچ محی الدین ڈار
اراتھ، تحصیل نربل، ضلع بڈگام
موبائل : 9541191350

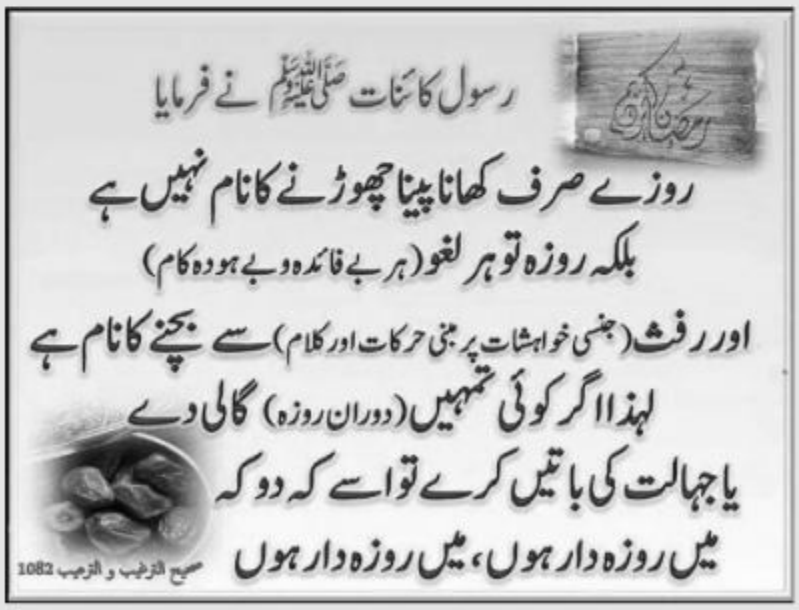

www.urduacademyts.com

غزلیں

ڈاکٹر مسعود جعفری

میں سوچتا ہوں تری شکل سے میں پیار کروں
شب وصال میں آنکھوں سے آنکھیں چار کروں

بلند تیرے ہی اطراف میں حصار کروں
روش میں تیری ہی چاہت کی اختیار کروں

ہر ایک زینہ سے آگے مقام ہے تیرا
تجھے میں چاند ستاروں میں کیا شمار کروں

تجھے ہی ساقیا اپنا بناؤں ساری رات
ترے ہی ہاتھ سے پی لوں بہت خمار کروں

ترا ہی ذکر کئے جاوں روزو شب جاناں
ترے ہی نام سے چاہت کا کارو بار کروں

نہ جانے کب وہ نکل آئے جعفری پھر سے
سڑک پہ بیٹھ کے اس کا ہی انتظار کروں

☆☆☆

مکان نمبر: 8-1-43/1/A/5، ستیہ کالونی، شیخ پیٹ، حیدرآباد۔ 008 500
Cell: 9949574641

ڈاکٹر محسن جلگانوی

اکیلا ایک پل بھی چھوڑتا نہیں
گیا ہے گھر سے وہ دل سے گیا نہیں

وہ اپنے آنسوؤں سے بولتے تھے
انہیں کہتے ہوئے کچھ بھی سنا نہیں

ستاتا ہے ہمیں کیوں کر زمانہ
زمانے کا تو ہم نے کچھ لیا نہیں

اب اس کے بعد میں کیسی ندامت
نہیں کہنا تھا جب اس نے کہا نہیں

وہ آیا لوٹ کر، سب کچھ گنواکر
مرے نزدیک جب کچھ بھی بچا نہیں

سبھی رستے یہیں ملتے ہیں آکر
یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں

سمندر درمیاں میں آگیا تھا
ندی سے رابطہ میرا ہوا نہیں

کورونا منہ چھپائے پھر رہا تھا
ہماری آنکھ سے لیکن بچا نہیں

مرے الفاظ بے آواز ٹھہرے
جو کہنا چاہتا تھا وہ کہا نہیں

رکھیں گے یاد تجھ کو شہر کوفہ
کہ تیرے خون میں جنس وفا نہیں

☆☆☆

فلیٹ نمبر:209، ڈی وی اپارٹمنٹ، سالار جنگ کالونی،
ٹولی چوکی، حیدرآباد۔ 008 500
Cell: 9505967365

www.urduacademyts.com

ذکی طارق

غزل

کہو، اک دوسرے کی کب ضرورت ہو گئے ہم تم
بھلا کیسے گرفتارِ محبت ہوگئے ہم تم

انا، عدل، آتما، سچ سب کا سودا یار کر بیٹھے
ستم ہے اس طرح سے نذرِ غربت ہوگئے ہم تم

محبت کے مقدس محترم ماحول میں رہ کر
ذرا دیکھو تو کتنے خوبصورت ہوگئے ہم تم

غلط فہمی، غرور و شان و ضد اور وہم کے ہاتھوں
بس اک پل میں محبت سے عداوت ہوگئے ہم تم

زہے قسمت اے ہمدم اپنے فرطِ عشق کے صدقے
جنوں کی ایک تاریخی حکایت ہوگئے ہم تم

چھٹے جب بدگمانی کے اندھیرے تب سمجھ پائے
کہ ترکِ عشق سے محرومِ نعمت ہوگئے ہم تم

ہماری دوستی کو دیکھ کر کُڑھتے ہیں بیچارے
جہاں والوں کی خاطر یار زحمت ہوگئے ہم تم

سبھی کہتے ہیں طفلی میں بہت معصوم بھولے تھے
جواں ہو کر بھلا کیسے قیامت ہو گئے ہم تم

☆☆☆

ایڈیٹر ہفت روزہ ''صدائے بسمل''، بارہ بنکی
سعادت گنج، بارہ بنکی (اترپردیش) پن کوڈ۔225206

فرید سحر

مزاحیہ غزل

سب سے مل جُل کر سدا رہتا ہوں میں
قرض لیکر اُن سے پھر چُھپتا ہوں میں

مُسکرا کر سب سے ہی ملتا ہوں میں
بغض بھی دل میں بہت رکھتا ہوں میں

خوش کسی کو دیکھ میں سکتا نہیں
جیت پر اوروں کی جو جلتا ہوں میں

ظُلم بڑھتا جا رہا ہے ہر طرف
خون کے آنسو بہت روتا ہوں میں

داد محفل میں ملے گی کس طرح
آئیں، بائیں، شائیں جو پڑھتا ہوں میں

میں کسی دُشمن سے بھی ڈرتا نہیں
دوستوں سے ہاں مگر ڈرتا ہوں میں

مانگنے کو قرض گر آئے کوئی
مُبتلا سر درد میں ہوتا ہوں میں

اسکرو تھوڑا سا ڈھیلا ہو گیا
جو بھی دل میں آئے وہ بکتا ہوں میں

لوگ سب کھلی اُڑاتے ہیں مری
بات سچ جب بھی سحر کہتا ہوں میں

☆☆☆

مکان نمبر: 20-7-21/A/1، اندرون فتح دروازہ، حیدرآباد۔ 500 065
Cell: 9848084306

نظام سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر کی ایک خوب صورت غزل

زخم کھانے سے دلِ بیمار اچھا ہوگیا
دردِ دل جاتا رہا قاتل مسیحا ہوگیا

پارہ پارہ دل ہوا ٹکڑے کلیجا ہوگیا
تیغِ ابرو سے جو قاتل کا اِشارا ہوگیا

پھر بہار آئی چمن میں، پھر مجھے اُچھلا جنوں
پھر مرا زخمِ کہن، قسمت سے تازا ہوگیا

شام کو آنے کا وعدہ تھا، مگر کیا کیجئے
وہ نہ آئے مفت میں، خونِ تمنا ہوگیا

جام ہے، ساقی ہے، مَے ہے، شاہدِ مقصود ہے
خوبی قسمت سے کیا سامان پیدا ہوگیا

غیر حالت دیکھ کر میری، تمہارے عشق میں
آج تو دشمن بھی دل سے دوست اپنا ہوگیا

اب ہزار اِس کو مٹائے کوئی مٹ سکتا نہیں
نقشِ اُلفت، لوحِ دل پر میری کندا ہوگیا

آفتیں کیا کیا اُٹھائیں، رنج و غم کیا کیا سہے
سنگدل کے عشق میں پتھر کلیجا ہوگیا

چارہ گر سے پوچھئے، اب کس کا کرتا ہے علاج
دردِ اُلفت سے مرے دل کا مداوا ہوگیا

مجھ کو سمجھانے یہ آئے ہیں تماشا دیکھئے
بیٹھے بیٹھے آج ناصح کو بھی سودا ہوگیا

جس طرف دیکھو یہی چرچا، یہی افسانہ ہے
عشق میرا کیا ہوا عثماںؔ تماشا ہوگیا

Urdu Monthly

Qaumi Zaban

AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY

Vol. 07 No. 04 April, 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622

Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022

Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

رمضان المبارک کے انتظامات کے سلسلہ میں معزز ارکان اسمبلی اور محکمہ اقلیتی بہبود کے عہدیداروں کے ساتھ جائزہ اجلاس میں جناب کوپّولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معمرین ومعذورین، جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ، محابس وفائر سروسیز، جناب ٹی۔ سرینواس یادو عزت مآب وزیر برائے افزائش مویشیان، سمکیات، ڈائری ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور سینماٹوگرافی، جناب اے کے خان، آئی پی ایس (ریٹائرڈ) عزت مآب مشیر اقلیتی بہبود، شہر حیدرآباد کے معزز ارکان اسمبلی، جناب احمد ندیم آئی اے ایس پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، جناب شاہ نواز قاسم آئی پی ایس ڈائرکٹر اقلیتی بہبود و دیگر عہدیداران دیکھے جاسکتے ہیں۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 91-04-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com